سیاسی، ادبی اور علمی تحریروں کا مجموعہ

روشن خیال

کتابی سلسلہ

۱

روشن خیال

کتابی سلسلہ

(۱)

مشاورت
زاہدہ حنا

ادارت
ندیم اختر
اظہر عباس

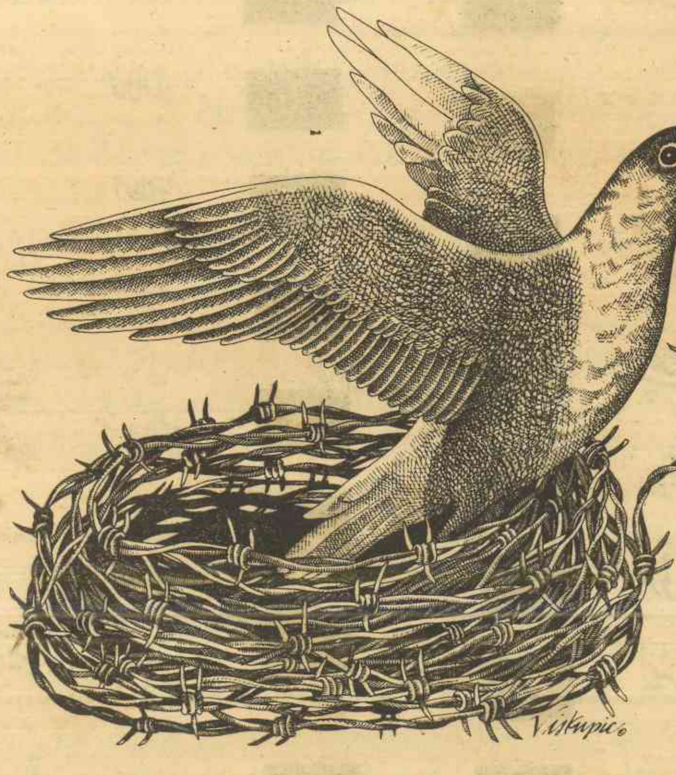

پوسٹ بکس ۱۱۱۳۶ گلشن اقبال، کراچی ۴۷

PRICE Rs. 8.

طابع: امین برادرز

روشن خیال

اداریہ	ادارہ	۷
حالیہ انتخابات	اظہر عباس	۸
سندھ قومی اتحاد	کمال وارثی	۱۰
حسن ناصر شہید	احسن علی مرزا	۱۴
دو یادگار خطوط	حسن ناصر	۱۶
آمریت کے دور کا سب سے شرمناک سانحہ	سید سبط حسن	۱۷
آئی این ایف معاہدہ	جمال نقوی	۱۲
سوویت معاشرے میں تبدیلیاں	سعید رضا سعید	۲۶
ریاستی تشدد اور ایذا رسانی	ندیم اختر	
تعلیم یافتہ پاکستانی خواتین اور مغرب زدگی کی اصطلاح	وارث میر	۱۹
ذرائع ابلاغ پر سامراجی قبضہ	ناظر محمود	۳۰
ذہنی مہارت کا انخلاء	اظہر عباس	۲۳
کراچی کے عوام اور بجلی کا نظام	خاور	۲۵
چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا	قرۃ العین حیدر	۳۴
روشنی اور خوشبو	رحمت اللہ مانجوٹھی	۴۰
ترقی پسند ادب	احمد ہمدانی	
لیٹرز فرام اے ڈیڈ مین	زاہدہ حنا	۳۲
سعادت حسن منٹو	ظ انصاری	۴۲
غزلیں اور نظمیں	فیض احمد فیض۔ خالد علیگ، پروین شاکر۔ محمد میاں، عشرت آفریں	۲۹
تھیوکریسی	سید سبط حسن	۴۴

روشن خیال

’روشن خیال‘ کتابی سلسلے کا پہلا شمارہ پیشِ خدمت ہے!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے سماج میں جہاں رنگین، چمکدار اور دیدہ زیب رسائل و جرائد کا ایک سیلاب سا اُمڈا ہوا ہے، وہاں ’روشن خیال‘ کی کیا ضرورت ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ ہمارے سماج کو ’روشن خیال‘ کی جتنی ضرورت آج ہے، اتنی شاید کبھی نہ تھی۔ مارکس نے کہا تھا کہ انقلابی خیالات کی بنیادی شرط انقلابی طبقے کا وجود ہے۔ اگر کسی سماج میں انقلابی طبقہ سرے سے موجود ہی نہیں تو وہاں انقلابی خیالات کا وجود ممکن نہیں کیونکہ خیالات آسمانوں سے نہیں اترتے، زمین پر سانس لینے والے انسانوں کے ذہنوں میں اکھوے کی طرح پھوٹتے ہیں۔

پاکستانی سماج میں انقلابی خیالات رکھنے والوں کی کمی نہیں لیکن یہاں کے استحصالی معاشرے میں ایسے رسائل و جرائد کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے جو انقلابی فکر کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہو سکیں۔ یاد رہے کہ انقلابی فکر رکھنے والا طبقہ جب تک سماج میں وسیع پیمانے پر اثر و نفوذ کا اہل نہیں ہوگا، اس وقت تک انقلاب کی راہ ہموار نہیں ہو سکے گی۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کے سرچشموں پر عقل دشمنی، کہنہ پرستی، تاریک خیالی اور تنگ نظری کی تبلیغ کرنے والوں کا اجارہ ہے۔ یہ صورتحال ہماری ذہنی اور تہذیبی تاریخ کا شدید خسارہ ہے اور اس خسارے کی تلافی کرنا ہم میں سے اُن سب کا فرض ہے جو علم کو جہل پر، عقل کو جنون پر اور شعور کو توہّم پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس فرض کو ادا کر کے ہی اُس انقلاب کا راستہ ہموار کیا جا سکتا ہے جو ہمارے سماج پر ایک مدت سے قرض ہے۔

آج ہمیں ان تحریروں کی ہمیشہ سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جو اس عظیم مقصد کو پورا کرنے میں مدد دے سکیں اور اس پُر آشوب دور کے غیر مطمئن، دو عظیم جنگوں کے زخم خوردہ، طبقاتی استحصال کے شکار اور تیسری جنگِ عظیم کی دہشت سے نڈھال اور پریشان خیال انسان کو پُر امیدی، حوصلہ مندی اور جمال پرور قلندری کے جذبات سے پُرمایہ کر سکیں۔

’روشن خیال‘ ایسی ہی سیاسی، فکری، ادبی اور تخلیقی تحریروں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس وقت ہمارا ملک انتخابی عمل کی ہیجانی اور ہنگامی صورتحال سے دوچار ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں اس صورتحال کا معروضی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نومبر کا مہینہ انقلابیوں کے سینے میں حسن ناصر شہید کی یادوں کو بھڑکا دیتا ہے۔ اسی حوالے سے حسن ناصر شہید کی والدہ محترمہ زہرہ علمبردار کا ایک یادگار انٹرویو، ممتاز انقلابی دانشور سید سبط حسن کی تحریر اور بعض دوسری تحریریں شائع کی جا رہی ہیں۔ ’روشن خیال‘ میں شائع ہونے والی یوں تو ہر تحریر نہایت پُرمغز اور خرد افروز ہے لیکن آخر میں سید سبط حسن کا مضمون ’تھیوکریسی‘ بطور خاص شائع کیا جا رہا ہے جو انقلابی فکر رکھنے والوں کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہے گا۔ برصغیر کی عظیم ادیب، قرۃ العین حیدر کا افسانہ ’چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا‘ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے خاصے کی چیز ہے۔

’روشن خیال‘ آئندہ بھی ایسی ہی سیاسی، فکری، ادبی اور تخلیقی تحریروں کا مجموعہ رہے گا۔ یہ محض ایک کتابی سلسلہ نہیں ایک فکری تحریک ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ اور آپ ایسے تمام روشن خیال اور صاحبِ نظر ساتھی اس تحریک میں ہمارے ساتھ قلمی تعاون کریں گے تاکہ معاشرے میں روشن خیالی، خرد افروزی، وسیع النظری اور انسان دوستی کی فضا عام ہو سکے اور آپ اور ہم اپنا وہ تاریخی کردار ادا کر سکیں جس کے لیے وقت نے ہمیں منتخب کیا ہے۔

حالیہ انتخابات ایک تجزیہ

اظہر عباس

مشہور شاعر علی سردار جعفری اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں "نومبر میرا گہوارہ ہے یہ میرا مہینہ ہے۔" جعفری صاحب نے تو یقیناً یہ بات کسی اور حوالے سے کہی ہے، لیکن آج پاکستان کے کروڑوں عوام نومبر ۸۸ء کو اپنی اُن بے شمار قربانیوں کے ثمر کے طور پر دیکھ رہے ہیں جو انھوں نے گذشتہ گیارہ برسوں میں دی ہیں۔ ۱۶ر نومبر کو ہونے والے انتخابات کا رُخ انوازِ حکومت کیا ہو سے زیادہ کون حکومت کرے کی طرف موڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر اس کے باوجود اس کی اہمیت کم نہیں کہ ۱۱ سال بعد عوام کو اقتدار میں شرکت کا موقع مل رہا ہے۔

حالیہ انتخابات لڑنے والوں کے خیالات خاصے مختلف اور اُن کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ مگر اب مقابلہ براہ راست دو ہی قوتوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ ایک جانب انتہائی دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جماعتیں ہیں جو اسلامی جمہوری اتحاد (IJI) کے بینر تلے جمع ہیں۔ دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کی قوتیں ہیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد درحقیقت جنرل ضیاء کے دور کا تسلسل ہے۔ اس میں شامل قوتیں ملک کی سیاسی اور سماجی ساخت میں کسی قسم کی تبدیلی کی خواہش مند نہیں۔ جبکہ دوسری طرف پیپلز پارٹی ہے جو اقتدار میں آنے کے لیے حکمرانوں کو مسلسل یہ یقین دلا رہی ہے کہ وہ ملکی ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کرے گی لیکن پیپلز پارٹی میں حکومتی دھڑے کے حامیوں سے زیادہ تعداد مخلص کارکنوں کی ہے جن پر حکمران اعتماد کرنے کو تیار نظر نہیں آتے۔ بائیں بازو کی قوتیں انتخابات میں حصہ لینے کے علاوہ رجعتی قوتوں کے مقابلہ پر پیپلز پارٹی اور دیگر جمہوریت پسند قوتوں کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ان ترقی پسندوں کا کردار اس وقت بہت اہم ہے۔ آیا وہ جمہوری قوتوں کا ساتھ دیتے ہیں یا ایسے امیدواروں کا جن کی حمایت سے اس وقت جمہوری تحریک کمزور اور رجعتی قوتیں مضبوط ہوں گی۔

انتخابات کے اس عمل میں ایک کثیر تعداد ایسے افراد کی ہے جو اپنے گیارہ سالہ ماضی کی پردہ پوشی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جدوجہد کے ان گیارہ برسوں میں مختلف سیاسی جماعتوں اور افراد کے کردار اور مختلف اوقات میں اُن کے بدلتے ہوئے مؤقف کی وجوہات کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ کل کی بظاہر متضاد قوتوں کے آج اکٹھے ہو جانے اور سیاسی میدان میں تیزی سے ہونے والی صف بندی کو اس کے بغیر سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔

۱۹۸۳ء کی بحالی جمہوریت کی تحریک جس کو حکمران طبقے کے اقتدار سے محروم حصے صرف دباؤ ڈالنے اور اقتدار میں شرکت کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اُسے عوام کے شعور اور جدوجہد کے جذبے نے عوامی تحریک میں بدل دیا۔ یوں آخر میں مجبور ہو کر ان عناصر کو تحریک رکوانا پڑی۔ ۱۹۸۳ء کی تحریک حالانکہ سندھ میں ہی مرکوز رہی مگر اس جدوجہد کے نتیجے میں حکومت پر دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ اُسے ۹ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو نام نہاد صدارتی ریفرنڈم اور ۲۵ر فروری ۱۹۸۵ء کو غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کروانے پڑے اور جونیجو صاحب کی صورت میں ایک نام نہاد شہری حکومت سامنے آئی۔ غیر جماعتی الیکشن کا تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے بائیکاٹ کیا مگر جماعت اسلامی نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔

جمہوریت کی اس معمولی سی شکل نے ہی عوام کے دباؤ کے نتیجے میں حکومتی فیصلوں میں دراڑیں ڈال دیں۔ کچھ ہی عرصے بعد غیر جماعتی ایوان میں زرعی ٹیکس لگانے اور غیر پیداواری اخراجات کم کرنے کے بارے میں بحثیں ہونے لگیں۔ جنرل ضیاء اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود نویں ترمیمی بل کو اسمبلی سے پاس نہ کروا سکے۔ اسی دوران اسمبلی میں یہ رائے اُبھر کر سامنے آئی کہ پاکستان کو جینوا معاہدے پر دستخط کر دینے چاہئیں۔ اسی دوران بے نظیر بھٹو پاکستان کے سیاسی افق پر ایک انتہائی پرجوش انداز میں نمودار ہوئیں۔ بے نظیر گو کہ کسی قسم کی تحریک چلانے کے موڈ میں نظر نہیں آتی تھیں اور اُن کا مقصد واضح طور پر صرف اپنی قوت کا اظہار کرنا تھا لیکن اُن کے سیاسی جلسوں کی وجہ سے ملک میں ایک بار پھر جمہوریت کی بحالی کے لیے اٹھنے والی آوازوں میں زور پیدا ہونا شروع ہوا۔ مگر پیپلز پارٹی کی "انتظار کرو" کی پالیسی نے عوام میں ابھرنے والے جذبے کو کم کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۸۶ء کی بحالی جمہوریت کی تحریک میں ۱۹۸۳ء جیسی شدت پیدا نہ ہو سکی۔

جینوا معاہدے پر دستخط سے پہلے جونیجو صاحب نے مختلف سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کا اجلاس بلایا۔ یہ اس بات کا واضح اظہار تھا کہ حکومت دھڑے بندی کا شکار ہے اور جونیجو ...... سیاسی حلقوں میں اپنا اثر بڑھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جنرل ضیاء اب ان کی پہلے جیسی حمایت نہیں رہے تھے۔ اسی مہینے اپریل میں دو اہم واقعات ہوئے سانحہ اوجڑی کیمپ اور جینوا معاہدے پر دستخط۔ ان واقعات کے بعد حکمرانوں کے لیے اس لولی لنگڑی اسمبلی کو بھی برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ یوں ۲۹ مئی کو جنرل ضیاء نے اسمبلی توڑ دی اور کابینہ کو ختم کر کے نئی کابینہ میں ضیاء الحق نے صرف اپنی ہی لابی کے افراد کو شامل کیا۔ جنرل ضیاء نے ۱۶ر نومبر کو انتخابات کرانے کا مبہم وعدہ کیا۔ پیپلز پارٹی جو گذشتہ کچھ عرصے سے پیچھے ہٹی ہوئی نظر آ رہی تھی ایک بار پھر اُبھر کر سامنے آ گئی۔

اس بار پیپلز پارٹی کا جھکاؤ واضح طور پر دائیں بازو کی قوتوں کی جانب ہوتا گیا۔ پیپلز پارٹی جماعت اسلامی سے قربت دکھا کر اربابِ اقتدار کی نظروں میں اپنے آپ کو قابل قبول بنانا چاہتی تھی۔ اُس کے سامنے اُس وقت ایک ہی ٹارگٹ تھا کہ کسی بھی صورت میں ضیاء الحق کو ہٹایا جائے۔ جماعت اسلامی یہ محسوس کر رہی تھی کہ عوام کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے نتیجے میں حکومت کو جینوا معاہدے پر دستخط کرنے پڑیں گے۔ چنانچہ وہ بھی پیپلز پارٹی کی طرف جھکاؤ دکھا کر جنرل ضیاء کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ پروفیسر غفور نے پیپلز پارٹی کی قیادت سے ملاقاتیں کیں اور یہ بیان دیا کہ "پیپلز پارٹی بہت مظلوم پارٹی ہے۔" جماعت اور پیپلز پارٹی اس بات پر متفق تھے کہ الیکشن پی پی پی اور پی این اے کے معاہدے کی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔ اب یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت اسلامی کا بنیادی مقصد افغان مسئلہ پر حکومت کو پرانی پالیسی کی طرف گھسیٹنا تھا۔ جبکہ پی پی پی ضیاء کو تنہا کرنے کے لیے ایسی قوتوں کو اپنے قریب لا رہی تھی۔

۱۷ر اگست ۱۹۸۸ء کو بہاولپور کا واقعہ ہوا اور جنرل ضیاء الحق کے سیاسی منظر سے ہٹنے کے بعد نہ صرف ایک آئینی بحران پیدا ہو گیا بلکہ سیاسی توڑ جوڑ میں بھی بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ واقعۂ بہاولپور کے بعد سینٹ کے چیئرمین غلام اسحٰق خاں نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھالا اور ایک اعلیٰ اختیاری ادارہ، ایمرجنسی کونسل قائم کی جس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہان شامل ہیں۔ یہی آج کا مؤثر حکومتی ادارہ ہے۔ ایم آر ڈی کی تقریباً تمام جماعتیں ایمرجنسی کونسل کے قیام پر خاموش رہیں۔ اور انھوں نے صرف نگراں حکومتوں کے خلاف مہم شروع کر دی۔

جنرل ضیاء کے سیاسی منظر سے ہٹنے کے بعد صورتحال تبدیل ہو گئی۔ جماعت اور پی پی پی کا جو اتحاد بن رہا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ واقعۂ بہاولپور کے اگلے ہی روز قاضی حسین احمد کا بیان آیا کہ جماعت کو اب اپنی پالیسی کا از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔ پھر واقعی

جماعت نے اپنی سیاست کا رخ پہلے کی طرح بدل دیا اور ایک بار پھر ،، کی طرح حکمرانوں سے مل کر جمہوری قوتوں کے خلاف محاذ بنانے میں مصروف ہوگئی۔ انتخابات کا واضح پروگرام سامنے آنے کے کچھ ہی دن بعد دائیں بازو کا ایک اتحاد عوام کے سامنے آیا اور وہ تمام قوتیں جو ملک کے سیاسی و معاشی ڈھانچے کو جوں کا توں رکھنا چاہتی ہیں متحد ہونے لگیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد (اج ا) کے نام سے بننے والے اس اتحاد میں حکمراں مسلم لیگ جماعت اسلامی اور جتوئی کی نیشنل پیپلز پارٹی اہم ہیں۔ اس اتحاد کے بننے کے کچھ ہی عرصے بعد مسلم لیگ کا دوسرا دھڑا جس کی قیادت محمد خاں جونیجو کر رہے تھے اور حکمراں مسلم لیگ سے شدید اختلاف کے بعد الگ ہوگیا تھا ایک بار پھر ان سے جڑ گیا۔ وہ نواز شریف جنھوں نے کچھ ہی عرصے پہلے خوشاب میں جونیجو کی کار پر پتھراؤ کرایا تھا، اپنا ذاتی طیارہ بھیج کر جونیجو صاحب کو سندھڑی سے لاہور بلوایا اور مسلم لیگ کا غیر مشروط طور پر صدر بنا دیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سی قوتیں ہیں جو راتوں رات اتحاد بنواتی اور تڑواتی ہیں۔ جماعت کے امیر قاضی حسین احمد کے مطابق مسلم لیگ کو جوڑنے میں ان کی جماعت کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن پھر بھی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خود جماعت کو اس اتحاد میں جانے کے لیے کہاں سے دباؤ پڑا ہے۔

اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل جماعتوں کے علاوہ جناب اصغر خاں اور مولانا نورانی کی تحریک استقلال اور جمعیت علما پاکستان پر مبنی پاکستان عوامی اتحاد بھی ہے۔ شروع میں محمد خاں جونیجو کی مسلم لیگ بھی اس اتحاد کی ممبر تھی مگر پھر انھیں اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہونے ہی میں بہتری نظر آئی۔ جونیجو صاحب اور جناب جتوئی میں گو کہ ابھی تک شدید اختلاف نظر آتا ہے مگر پیپلز پارٹی اور اقتدار کی منتخب نمائندوں کو منتقلی کے خوف نے انھیں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اسلامی جمہوری اتحاد گو کہ ابھی صرف ایک انتخابی اتحاد ہے مگر انتخابات کے بعد بھی اس کے کردار کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ جماعت اسلامی انتخابات کو جہاد کے نام پر لڑ رہی ہے۔ یہ اقتدار جہاں ہے وہیں رکھنے کی پالیسی ہے۔ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ نتائج ان کے حق میں نہ نکلنے سے یہ انتہا پرست منفی رویہ بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ دوسری طرف اگر پیپلز پارٹی کو منتخب ہونے کے بعد بھی اقتدار کی منتقلی میں رکاوٹ ڈالی گئی تو اس سے بھی ملک کی فضا خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ سندھ میں بڑے پیمانے پر بننے والی فوجی چوکیوں کا بظاہر تو انتخابات کے بعد کے عمل سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا مگر مندرجہ بالا پس منظر میں اس کو رکھ کر دیکھیں تو کچھ کڑیاں ضرور ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) جس میں واقعہ بہاولپور کے بعد انتخابات اور سیٹوں کی تقسیم سے متعلق ایک ڈھیلا ڈھالا سمجھوتہ ہوا تھا اب تقریباً بکھر چکی ہے۔ لیکن اب بھی......

میں ایسی قوتیں موجود ہوں جو پی این اے نما اسلامی جمہوری اتحاد کے قائم ہونے کے بعد اس کے لیے کوشاں ہیں کہ ایم آر ڈی قائم رہے۔

پیپلز پارٹی اگرچہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ میدان میں اتری ہے۔ مگر اس میں وفادار کارکنوں کے علاوہ حکومتی دھڑا بھی موجود ہے، اپنی مہم کا رخ جنرل ضیاء کے دور اقتدار کے خلاف رکھنے کے باوجود اس نے تقریباً ۴۴ ایسے افراد کو ٹکٹ دیے ہیں جو نامزد مجلس شوریٰ یا غیر جماعتی اسمبلی کے رکن رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی مخالفت کے باوجود ان کو بھی بڑی تعداد میں ٹکٹ دیے گئے ہیں۔ ان سب کو ٹکٹ دے کر پی پی امریکہ اور ملکی حکمرانوں کو یہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ قابل اعتماد ہے۔ پیپلز پارٹی کو معلوم ہے کہ اقتدار

اسلامی جمہوری اتحاد ملک میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتا۔

میں آنے کے لیے اسے یہ گارنٹی دینا ہوگی کہ وہ ملکی ڈھانچے کو جوں کا توں رکھے گی۔ اسی لیے بے نظیر بھٹو بھی بار بار کہہ چکی ہیں کہ ہمارا فوج سے کوئی جھگڑا نہیں۔

انتخابات میں اب واضح مقابلہ اسلامی جمہوری اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان ہے۔ اصغر خاں اور مولانا نورانی کے پاکستان عوامی اتحاد کے لیے دو چار نشستوں سے زیادہ حاصل کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ سندھ کے شہری علاقوں میں ایم کیو ایم کے جیتنے کے امکانات کافی روشن ہیں، جبکہ اندرون سندھ پیپلز پارٹی اور دیگر جمہوریت پسند اور ترقی پسند امیدواروں کی کامیابی متوقع ہے مگر بعض جگہوں سے اسلامی جمہوری اتحاد کے لوگ بھی جیتیں گے۔ جبکہ بعض عناصر قومی حقوق کے چیمپئن بن کر جمہوری تحریک سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سندھ کا کوئی پیر کسی دوسرے پیر کے خلاف الیکشن نہیں لڑ رہا۔ گویا عوام کے خلاف پیروں کا اتحاد زندہ باد۔ سرحد اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی شاید اکثریت نہ حاصل کر سکے لیکن کچھ مضبوط امیدواروں کے علاوہ بعض جگہوں پر اسے این پی اور جے یو آئی سے اتحاد کرکے بھی وہ کچھ نشستوں پر جیت سکتی ہے۔ اس طرح پیپلز پارٹی کا اصل میدان پنجاب ہی ہوگا اور یقیناً یہاں سے وہ اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔ جبکہ اے این پی اور جے یو آئی کی وہ صورت نظر نہیں آتی جو ۱۹۷۱ء میں تھی اور ان کے لیے سرحد اور بلوچستان میں اکثریت حاصل کرنا اب ممکن نہیں۔

اس طرح ایک طرف تو انتہائی دائیں بازو کی قوتیں اب اسلامی جمہوری اتحاد میں جمع ہو رہی ہیں۔ جبکہ پاکستان عوامی اتحاد اس کے باہر کے دائرے میں نظر آتا ہے۔ پی پی پی اور جے یو آئی درمیان میں اور ولی خاں، بزنجو اور معراج وغیرہ بائیں طرف ہیں۔ کچھ بائیں بازو سے منسوب امیدوار ایسے بھی ہیں جن کی وفاداری واضح نہیں اور ووٹوں کی خاطر وہ مختلف اور اکثر متضاد رخوں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ انتہائی بائیں بازو کے ایک ہی امیدوار جام ساقی بھی الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں۔ جام ساقی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے پولٹ بیورو کے رکن ہیں اور پاکستان میں سب سے طویل قید کاٹ چکے ہیں یعنی وہ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۶ء تک قید و بند کی صعوبتیں اٹھا چکے ہیں۔ جام ساقی حلقہ ۱۷۶ اور صوبائی اسمبلی حلقہ ۵۷ سے انتخاب لڑ رہے ہیں۔ ان کے اہم مخالفین میں مسلم لیگ کے ارباب امیر حسن ہیں جن کی وہ آبائی نشست ہے اور پی پی پی کے غلام محمد میمن ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ دوسرا موقع ہے کہ کوئی امیدوار کمیونسٹ پارٹی کے نام سے الیکشن لڑ رہا ہے۔ چالیس سال قبل مرزا ابراہیم نے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑا تھا۔

سیاسی مبصرین کے اندازوں کے مطابق پیپلز پارٹی انتخابات میں اکثریت حاصل کرلے گی۔ لیکن الیکشن کے بہت قریب کافی گہماگہمی نظر آتی ہے اور مختلف علاقوں میں فسادات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی وجہ سے کم از کم سندھ میں انتخابات فوجی چوکیوں (جن کی تعبیر ابھی واضح نہیں ہے) کے سائے میں ہو رہے ہیں۔ حکمرانوں کے لیے گو کہ واقعہ بہاولپور اور اس کے بعد عدلیہ کے مثبت کردار کے بعد انتخابات کرانا ناگزیر ہوگیا ہے۔ مگر پھر بھی وہ اپنی پوری کوشش کریں گے کہ صورتحال جوں کی توں رہے۔ الیکشن میں اگر وہ اسلامی جمہوری اتحاد کو تمام تر کوششوں کے بعد بھی کامیاب نہیں کروا سکے تو اقتدار منتقل کرنے میں ضرور روڑے اٹکائیں گے ظاہر ہے انتخابات صرف مرحلہ ہیں کہ اس کے بعد اصل مسئلہ منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقلی ہے ماضی کا یعنی ۱۹۷۱ء کا تجربہ اس سلسلے میں خاصا حوصلہ شکن ہے۔ لیکن اس بار کمزور حکومت ہونے اور عدلیہ کی نگرانی کی وجہ سے ہو سکتا ہے فرق پڑے۔ بہرحال دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان میں منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی کا سفر کامیابی سے طے ہوسکتا ہے یا نہیں؟

**

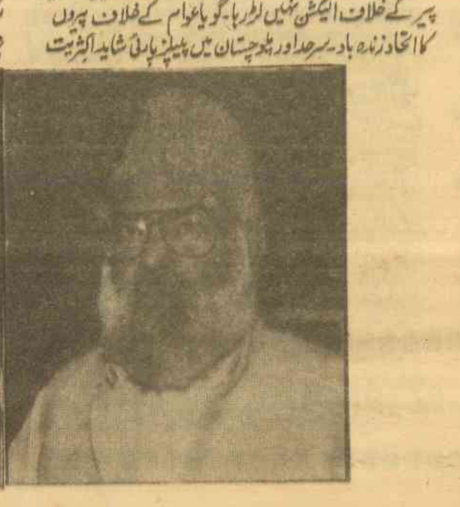

سندھ قومی اتحاد

کمال وارثی

۱۶ نومبر ۸۸ء کا دن پاکستان کی جمہوری تاریخ کا ایک اہم دن قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دن بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ملک میں تیسرے عام انتخابات منعقد ہونے والے ہیں۔ یوں تو پورا ملک ایک پرجوش انتخابی عمل سے گزر رہا ہے لیکن صوبہ سندھ بالخصوص اکثر ماہرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کی اہم وجہ وہ سیاسی شعور ہے جو اس صوبے میں پایا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے کئی عناصر ایسے ہیں جو اس صوبے میں ہونے والے عام انتخابات پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سندھ قومی اتحاد (SNA) ایک ایسا اتحاد ہے جو یقیناً انتخابات پر اپنے اثرات مرتب کرے گا۔ یہ اتحاد اسی سال وجود میں آیا لیکن اس نے ایک مختصر عرصے میں اپنی سیاسی اہمیت منوالی۔ اس اتحاد میں مختلف رجحانات اور فکری رویے رکھنے والے افراد، گروپ اور جماعتیں شامل ہیں۔ جس کے باعث اس اتحاد کے اندر باہمی رسہ کشی اور بھاگ دوڑ کا عمل فطری طور پر جاری رہتا ہے۔ چونکہ آنے والے انتخابات کے حوالے سے سندھ قومی اتحاد کے سیاسی کردار اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں مختلف سوالات اٹھائے جا رہے ہیں اس لیے اس اتحاد کی سیاسی ہیئت ترکیبی اور اس میں مصروف عمل مختلف سیاسی و فکری جماعتوں و گروہوں کے باہمی ربط اور تضادات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

صوبہ سندھ میں سیاسی بے چینی کی سطح دوسرے صوبوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ اس بے چینی کے پس پشت چند عوامل کارفرما ہیں جن میں بے روزگاری اور انتقال آبادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بعض مسائل سب سے اہم ہیں۔ انھیں مسائل کے باعث ۸۶-۸۳ کی بحالی جمہوریت کی تحریکیں اس صوبے میں سب سے زیادہ موثر ثابت ہوئیں۔ یہ تحریکیں بظاہر کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئیں لیکن ان کے اثرات سندھ میں نمایاں طور پر محسوس کیے گئے۔ سندھ میں پائی جانے والی سیاسی بیداری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قومی حقوق کے حوالے سے جدوجہد کرنے والے متعدد گروہ اس صوبے میں موجود ہیں۔ ان گروہوں میں بعض امور پر سیاسی گروہ سندھ کے سماج میں پائے جانے والے مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان گروہوں میں جی ایم سید کی جئے سندھ تحریک، کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان اور رسول بخش پلیجو کی سندھی عوامی تحریک (جو اب ANP میں ضم ہو چکی ہے لیکن جس کی ذیلی تنظیمیں بدستور قائم ہیں) خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تنظیموں میں باہمی ربط کا سلسلہ ۱۹۸۵ء میں شروع ہوا۔ جئے سندھ تحریک، کمیونسٹ پارٹی

اب اس لیے ہے کہ یہ ان گروہوں میں بعض امور سیاسی قدر مشترک موجود ہے لیکن اکثر معاملات ایسے ہیں جن پر نظریاتی اختلافات پائے جاتے ہیں

آف پاکستان، سندھی عوامی تحریک اور وطن دوست انقلابی پارٹی کے درمیان یہ طے پایا کہ ان کی طلباء تنظیمیں ایک دوسرے سے

متصادم ہونے سے گریز کریں گی، تعاون و باہمی اشتراک کا رویہ اختیار کریں گی اور نظریاتی اختلافات کے اظہار میں طاقت کی بجائے دلیل کا استعمال کریں گی۔ انھی دنوں جی ایم سید، پروفیسر جمال نقوی، جام ساقی اور رسول بخش پلیجو جناح اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں زیر حراست تھے۔ باہمی تعاون کے مذکورہ مسودہ کے تیار ہونے کے بعد جب اس پر دستخط ثبت کرنے کا مرحلہ آیا تو ایک پیچیدگی اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئی جب سندھی عوامی تحریک کے رسول بخش پلیجو نے کسی ایسے مسودے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جس پر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے بھی دستخط ہوں۔ اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ مسودے کی دو نقلیں تیار کی گئیں۔ ایک پر جئے سندھ نے اور دوسری پر رسول بخش پلیجو نے دوسروں کے ساتھ الگ الگ اپنے دستخط کیے۔

باہمی اشتراک عمل کا دوسرا قابل ذکر مرحلہ ۱۹۸۷ء میں اس وقت آیا جب سندھ کے مسائل پر غور و خوض کرنے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کی غرض سے مٹھی میں ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کرنے میں دیگر جماعتوں کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی، سندھ ہاری کمیٹی اور ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کانفرنس سے کوئی ٹھوس اور مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور اس کی ذمہ داری عمومی طور پر سندھ عوامی تحریک کے رسول بخش پلیجو پر عائد کی جاتی ہے جنہوں نے اس کانفرنس میں آغاز سے ہی انتہائی منفی رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے کانفرنس میں شدید بدمزگی بھی پیدا ہو گئی۔

مٹھی کانفرنس کے کچھ عرصے بعد رسول بخش پلیجو اور سندھ کے چند دانشوروں اور تنظیموں نے سندھ کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک اجتماع منعقد کیا جس میں کمیونسٹ پارٹی کے جام ساقی نے بھی شرکت کی۔ رسول بخش پلیجو نے اس اجتماع میں بھی اپنے اعتراضات پر اصرار کیا اور کسی وسیع تر اتحاد کے لیے درج ذیل تین شرائط پیش کیں۔

۱۔ کمیونسٹ پارٹی کا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہوگا۔
۲۔ جی ایم سید کو مدعو نہیں کیا جائے گا۔
۳۔ مجوزہ اتحاد میں صرف ایسے افراد شرکت کے اہل ہوں گے جو نسلاً سندھی ہوں گے۔

کمیونسٹ پارٹی کے جام ساقی نے رسول بخش پلیجو کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ ان کا موقف یہ تھا۔

۱۔ ان کی (جام ساقی) پہچان کمیونسٹ پارٹی سے ہے اور اگر وہ اس اتحاد میں اسی حوالے سے شریک ہوں گے۔
۲۔ جی ایم سید صاحب کو دعوت نامہ بھیجا جانا چاہیے۔ شرکت کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ وہ خود کریں۔
۳۔ ہر اس تنظیم کو اتحاد میں شامل ہونے کی دعوت دینی چاہیے جو اس کے پروگرام سے اتفاق رکھتی ہو۔ قطع نظر اس امر سے کہ مذکورہ تنظیم کے ارکان نسلاً سندھی ہیں یا کسی اور لسانی اکائی

قومی حقوق کے حوالے سے جدوجہد کرنے والے متعدد سیاسی گروہ مصروف عمل ہیں۔

رسول بخش پلیجو نے مسودے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

سے تعلق رکھتے ہیں۔

جام ساقی کے اس موقف کو منظور نہیں کیا گیا چنانچہ جام ساقی وطن دوست انقلابی پارٹی کے ارباب کھاوڑ، سندھ ہاری کمیٹی کے فوٹو استمانی اور ڈی ایس ایف کے علی حسن چانڈیو اور خادم بھیم نے اس اجلاس میں قائم ہونے والے سندھی عوام کے قومی اتحاد سے علیحدگی اختیار کر لی۔

سندھی عوام کے قومی اتحاد نے اپنے قیام کے فوراً بعد اندرون سندھ اور کراچی سمیت سندھ کے کئی شہروں میں جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جن میں تنگ نظر قوم پرستی کا بھرپور پرچار کیا گیا اور سندھی عوام کو دیگر لسانی اقلیتوں کے خلاف بھڑکایا گیا۔ اسی دوران جام ساقی نے وطن دوست پارٹی، پاکستان نیشنل پارٹی، پختے سندھ تحریک اور کئی دوسرے چھوٹے بڑے گروپوں کو یکجا کر کے ۱۴ اپریل ۸۰ کو سن میں ایک اجلاس منعقد کیا جن میں مندرجہ ذیل چار نکات منظور کیے گئے۔

۱۔ کالا باغ ڈیم کی منسوخی۔
۲۔ سندھ میں فوجی چھاؤنیوں کو ختم کرنا۔
۳۔ سندھ میں ہونے والے انتقال آبادی کو روکنا۔
۴۔ تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی۔

سن میں ہونے والے اس اجلاس کا سب سے مثبت پہلو یہ تھا کہ جو بھی لسانی اقلیتی تنظیم یا سیاسی جماعت ان چار نکات کی تائید کرے گی وہ مجوزہ اتحاد میں شامل ہو سکتی ہے۔ اسی اجلاس میں جی ایم سید نے سندھو دیش کا نعرہ ترک کر کے مذکورہ بالا چار نکات پر تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ اس اجلاس میں رسول بخش پلیجو اور سندھی عوام کے قومی اتحاد (SNA) میں شامل دیگر عناصر بھی شامل تھے۔

اس اتحاد کا اجلاس ۲۰ مئی کو دوبارہ منعقد ہوا لیکن اس اجلاس میں پہلے سے طے شدہ اس فیصلے کو کہ اتحاد کے نکات سے متفق ہر لسانی اقلیت اجلاس میں شرکت کر سکتی ہے منسوخ کر دیا گیا اور یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ اب اتحاد کے اجلاس میں صرف نسلاً سندھی نمائندے ہی شرکت کر سکتے ہیں۔ اس پابندی پر کمیونسٹ پارٹی نے واضح کر دیا کہ وہ اتحاد میں شامل رہے گی لیکن لسانی تنگ نظری کی حمایت نہیں کرے گی۔ چنانچہ اتحاد کے مذکورہ اجلاس میں اس کا کوئی نمائندہ شریک نہیں ہوا۔ اس اجلاس میں رسول بخش پلیجو کی یہ تجویز رد کر دی گئی کہ اتحاد کا نام سندھ کی بجائے سندھی، قومی اتحاد رکھا جائے۔ اجلاس میں یہ بات پھر دوہرائی گئی کہ اتحاد کے پروگرام کی حامی کوئی بھی لسانی اقلیتی فرد یا تنظیم اتحاد میں شامل ہونے کی مجاز ہے۔ اتحاد کو سرگرم عمل رکھنے کی غرض سے ایک رہبر کمیٹی تشکیل دی گئی اور اتحاد کے پروگرام میں دو نئے نکات یعنی سندھ کی قومی زبان سندھی ہو اور معدنی و قدرتی وسائل ہر صوبے کی ملکیت ہوں کا اضافہ کیا گیا۔

۱۴ اگست کو رہبر کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں شرکت کے لیے حفیظ پیرزادہ اور جام ساقی کو خصوصی دعوت دی گئی۔ اجلاس میں ایک مرتبہ پھر اس بات پر زور دیا گیا کہ سندھ قومی اتحاد میں دیگر لسانی اقلیتوں کی شمولیت کی راہیں کھول جائیں۔ ۲۰ ستمبر کو اتحاد کا ایک اور اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کا حوصلہ افزا اور مثبت پہلو یہ تھا کہ اس میں دیگر لسانی اقلیتوں کے نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ رسول بخش پلیجو اور ان کے دیگر حامیوں نے اتحاد کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ اس اجلاس میں چند اہم نوعیت کے فیصلے ہوئے۔ اس مطالبے پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں تاکہ اقتدار اعلیٰ عوام کے نمائندوں کو منتقل ہو سکے۔ اتحاد نے سندھ یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی اداروں میں بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کی اپیل کی تاکہ لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طالب علم امتحانات میں شریک ہو سکیں اور حصولِ علم میں انھیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

سندھ قومی اتحاد کا پس منظر اور ارتقاء کا مذکورہ بالا جائزہ ان عوامل اور قوتوں کا احاطہ کرتا ہے جو اس اتحاد کے قیام کی محرک ثابت ہوئیں لیکن اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس اتحاد میں صاف طور پہ دو مختلف سوچیں اور قوتیں بیک وقت متحرک نظر آتی ہیں۔ ایک سوچ اور قوت ایسی ہے جو تنگ نظر قوم پرستی کے فلسفے پر کام کرتی ہے جس کی نمائندگی ایسے افراد و طبقات کرتے ہیں جو سندھ کے مظلوم عوام میں پھوٹ ڈال کر اپنے مخصوص مفادات بچانا چاہتے ہیں۔ جبکہ دوسری قوت عوام کو متحد کرنے اور ان میں سیاسی ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہے جب تک سندھی عوام کا قومی اتحاد، برقرار رہا سندھ کی قومی حقوق کی جدوجہد مستقل الجھاؤ، ٹکراؤ، تنگ نظری، سطحی نعروں اور نسلی کشیدگی کے ماحول سے دوچار رہی۔ سندھ قومی اتحاد کے قیام سے صورتحال میں مثبت تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور حکمرانوں کی عوام میں پھوٹ ڈالنے اور سندھ میں نسلی فسادات کرانے کے منصوبوں کو ناکام بنانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے

انتخابات کے باعث ملک میں جمہوری عمل تیز ہوا ہے اور عوام کے بڑے پیمانے پر متحرک ہونے سے گزشتہ گیارہ برسوں سے قائم جمود ٹوٹ رہا ہے۔ صورتحال فوری طور پر SNA پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ اور آج سندھ قومی اتحاد متعدد مسائل سے دوچار نظر آ رہا ہے۔ تیز رفتار جمہوری عمل کے باعث اتحاد میں موجود مختلف عناصر کے تضادات، مفادات اور موقع پرستیاں تیزی سے ابھر کر سامنے آ رہی ہیں۔ SNA نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ انتخابی اتحاد نہیں ہے اور وہ براہ راست اپنے امیدوار کھڑے نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا کام سندھ کی قومی رائے میں یکسانیت پیدا کرنا ہے۔ اتحاد کی رہبر کمیٹی نے کچھ اور بھی ایسے نکات اس دوران اپنائے ہیں جو متنازعہ ہیں کیونکہ انھیں اتحاد کی جنرل باڈی کی تائید حاصل نہیں ہے۔ ان نکات میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ عام انتخابات قومی اسمبلی کے بجائے دستور ساز اسمبلی کے لیے کرائے جائیں یا پاکستان کی ہر قومیت کے لیے مکمل حق خودارادیت بشمول حقِ علیحدگی تسلیم کیا جائے تاکہ ایک رضاکارانہ وفاق بن سکے۔ اس بات کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ ۱۹۵۴ء کے بعد سندھ میں آنے والے افراد خود کو سندھی تصور نہیں کیے جائیں گے لیکن یہ تجویز متنازعہ ہے اور اس پر بعض لوگوں نے اپنا اختلافی نوٹ درج کرایا ہے جب کہ بعض دھڑوں نے اسے بنیاد بنا کر SNA سے علیحدگی اختیار کر لی۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ SNA گروہی مرکزیت کا شکار ہے۔ ایک طرف جام ساقی ہیں جنھیں دو ماہ یعنی اکتوبر اور نومبر کے لیے اتحاد کا مرکزی کنوینر چنا گیا ہے۔ وہ بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ اتحاد نے اپنا کوئی انتخابی امیدوار نامزد نہیں کیا ہے۔ حمیدہ کھوڑو اتحاد کی امیدوار نہیں ہیں اور اتحاد کو پیپلز پارٹی کے خلاف ایک دھڑے کے طور پر انتخابات میں استعمال کرنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا جائے گا۔ انھوں نے مختلف اضلاع میں کنوینگ کمیٹیاں تشکیل دی ہیں اور کراچی و حیدرآباد میں ہونے والے حالیہ تشدد اور افسوسناک واقعات کی ذمہ داری حکومت اور اس کے اہل کاروں پر ڈالی ہے۔ وہ یہ بھی مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان واقعات کی تحقیقات سپریم کورٹ کے جج سے کرائی جائے۔ دوسری طرف اتحاد کی رہبر کمیٹی کے چند ارکان آزادانہ طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور وہ نسلی اتحاد کے بجائے نسلی منافرت کو ہوا دے رہے ہیں۔ جی ایم سید جو اپنی ذات میں انجمن ہیں کسی اور ہی رخ پر گامزن ہیں۔ انھوں نے اتحاد کی جانب سے بعض امیدواروں کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ حالیہ خبروں کے مطابق وہ ان امیدواروں کی حمایت میں لاڑکانہ اور دیگر شہروں میں کئی انتخابی جلسوں سے خطاب بھی کرنے والے ہیں۔ ان کی کوشش غالباً یہ نظر آتی ہے کہ وہ سندھ کی قومی تحریک کو ملک کی جمہوری قوتوں سے متصادم کر دیں۔ انھوں نے اتحاد کی جانب سے جن امیدواروں کی حمایت کا اعلان کیا ہے ان میں رسوائے زمانہ مسلم لیگی، وڈیرے اور اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار کوٹل شاہ جیسے لوگ شامل ہیں۔

مذکورہ بالا تجزیے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ موجودہ انتخابی سرگرمیوں نے جس جمہوری عمل کو تیز تر کر دیا ہے اس کے نتیجے میں سندھ قومی اتحاد میں موجود تضادات ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ اور قومی حقوق کی دہائی دینے والے بعض عناصر اپنی رجعت پرستی اور سندھ کے عوام کی مخالف قوتوں سے اپنے قریبی طبقاتی رشتوں کو چھپانے میں مشکل کا سامنا کر رہے ہیں۔ اب یہ بات انتخابات کے بعد ہی پوری طور پہ واضح ہو گی کہ ایس این اے سندھ کے عوام کی حقیقی خواہشات کا اظہار ہے یا یہ ملک کے حکمران طبقات اور سندھی جاگیرداروں کا آلۂ کار ہے۔ ایس این اے کو جلد یا بدیر بہرحال یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ سندھ کے وہ طبقات جو حکمرانوں کے اتحادی ہیں وہ اتحاد میں رہ سکتے ہیں یا نہیں؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ سندھ کے قومی حقوق کی جدوجہد کو پاکستان کی جمہوری جدوجہد کے تناظر میں دیکھنے اور اس کے ساتھ جوڑنے کی ضرورت کو محسوس کیا جائے۔ انتخابات کے پس منظر میں اس ضرورت کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر سندھ کے حقوق کو پورے ملک کی جمہوری تحریک سے وابستہ نہ کیا گیا تو اس کے خطرناک نتائج سامنے آ سکتے ہیں اور تصادم و ٹکراؤ کی صورتحال پیدا ہو سکتی ہے۔

ملک کے دوسرے خطوں میں موجود قوتوں بالخصوص ترقی پسند اور جمہوری قوتوں کو چاہیے کہ وہ بھی اپنے مسائل کو اس طرح اٹھائیں کہ ان کی اور سندھ کے عوام کی جدوجہد میں اشتراک عمل پیدا ہو سکے۔ موجودہ صورتحال میں ترقی پسند، جمہوری اور محب وطن قوم پرست قوتوں کی ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان قوتوں کا باہمی اشتراک، ہم آہنگی اور اتحاد درست سمت میں جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے ناگزیر اور اولین شرط ہے۔

آئی این ایف معاہدہ

جمال نقوی

۔ر جنوری کو سوویت کونسلیٹ کے ثقافتی شعبہ کی طرف سے واشنگٹن سمٹ "امیدیں اور پیش بینیاں" کے عنوان سے ایوانِ دوستی میں ایک سیمینار ہوا۔ جس میں کی جانے والی پروفیسر جمال نقوی کی تقریر کا متن قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

آج ہم جس واقعہ پر تبصرہ کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یعنی وقت کے گذرنے کے ساتھ اس واقعہ کی اہمیت ماند پڑنے کے بجائے لوگوں کے ذہنوں میں مزید اجاگر ہوگی۔ یہ واقعہ درمیانہ مار کرنے والے نیوکلائی ہتھیاروں کو تباہ کرنے کے سلسلے میں ۸ دسمبر کو واشنگٹن میں ہونے والا معاہدہ ہے۔ جس پر صدر ریگن اور جناب گوربچوف نے دستخط کئے اور جو آئی۔ این۔ الیف (INF) کا معاہدہ کہلاتا ہے۔ اس معاہدے پر مبارک باد کے اتنے حقدار ہیں کہ مجھے فیصلہ کرنے میں دقت ہو رہی ہے کہ بات کہاں سے شروع کروں؟ چلئے صدر ریگن سے شروع کرتے ہیں۔ جو تاریخ کے افق پر سرد جنگ کے چاند کے طور پر ابھرے۔ لیکن جن کی سیاسی بصیرت نے انہیں یہ اعزاز بخشا کہ نیوکلائی ہتھیاروں کی پہلی قسط کی تباہی کا سہرا ان کے حصے میں آیا۔ صدر ریگن کو INF کا معاہدہ مبارک ہو۔

اس کامیابی کے معمار جناب گوربچوف بھی ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ وقت کے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے راستے ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اگر وقت کا تقاضا ہماری گرفت میں نہیں آ رہا ہے تو ہمیں گرفت میں لینے کے لئے اپنے طریقوں پر نظر ثانی کر کے ان نئے طریقوں کو دریافت کرنا ہوگا۔ جو ہمیں کامیابی کی منزل سے ہمکنار کریں۔ جناب گوربچوف کو INF کا معاہدہ مبارک ہو۔

اس معاہدے کا فوری ثمر یورپ کے لوگوں کو ملے گا۔ کیونکہ معاہدے کے تحت تباہ کئے جانے والے سارے نیوکلائی ہتھیاروں کا رخ خواہ وہ روسی ہوں یا امریکی یورپ کی طرف ہے۔ یورپ کے لوگ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۴۵ء کے ۳۱ سال کے قلیل عرصے کے درمیان دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں سے گزر چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم نے سوویت روس کی آبادی کے ہر دسویں آدمی کی جان لی۔ جرمنی اور دوسرے یورپی ممالک نے جن ہولناک تباہ کاریوں کا سامنا کیا۔ اس کا تصور کر کے ان سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں کو INF کا معاہدہ مبارک ہو۔

لیکن یہ کامیابی سب سے زیادہ یورپ اور دوسرے براعظموں کے عوام کی ہے جنہوں نے امن تحریک منظم کر کے عالمی امن کی طرف اس پیش قدمی کو ممکن بنایا۔ آخر جنگ میں انہی کی ماؤں کی گودیں خالی ہوتی ہیں اور انہی کی بیٹیوں کا سہاگ لٹتا ہے اور اگر نیوکلائی جنگ ہوئی تو انہی کی آبادیاں نیست و نابود ہوں گی۔ عالمی امن تحریک کو INF کا معاہدہ مبارک ہو۔

اس معاہدے کی رو سے تقریباً ۴۰۰ امریکی اور ۱۵۰۰ سوویت نیوکلائی ہتھیار تباہ کئے جائیں گے۔ یہ کل نیوکلائی ہتھیاروں کا صرف ۴% ہے۔ پھر بھی یہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ دنیا میں پہلی بار نیوکلائی ہتھیاروں کو تباہ کرنے کی ریت پڑ رہی ہے۔ یہ محض پہلا قدم ہے۔ کہتے ہیں ہزار میل کے سفر کا آغاز بھی ایک قدم ہوتا ہے۔ اگر آج کچھ نیوکلائی ہتھیار تباہ کئے جا رہے ہیں۔ تو کل . . . کیا کل مزید تبدیلیوں کی راہ نہیں کھلے گی۔ ہتھیاروں کا سلسلہ کم ہوگا۔ تو غذا، اسکول، کالج ہسپتال اور عوام کے فلاح و بہبود کے دیگر منصوبوں کے لئے مزید وسائل مہیا ہوں گے کا INF معاہدہ دنیا کے ناداروں اور ضرورت مندوں کے لیے امید کی کرن ہے۔

تخفیف اسلحہ سے سرد جنگ میں کمی ہوگی۔ یہ سرد جنگ بھی عجیب چیز ہے۔ اگلے زمانے کی جنگوں میں جاں بحق ہونے والوں کے علاوہ لوگ صحت مند زندگیاں گزارتے تھے۔ لیکن اب صورت اور ہے۔ دنیا کے ایک حصہ میں سوشلزم کے قیام نے جنگ کے راستے میں ایک مضبوط رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔ جس کو عالمی مزدور تحریک اور قوموں کی تحریک آزادی نے مضبوط تر بنا دیا ہے۔ سامراجی جنگ نہیں کر پا رہے ہیں۔ لیکن کہتے ہیں چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ سامراجیوں نے جب جنگ کرنا ناممکن پایا تو سرد جنگ پر اکتفا کیا۔ اس طرح جنگ کی ساری "برکتوں" سے محروم رہنے کے باوجود وہ کشیدگی کی فضا اور اسلحہ کی دوڑ کو جاری رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ جنگ کے مقابلے میں سرد جنگ انسانیت سے کوئی کم خراج وصول نہیں کرتی۔ سرد جنگ میں پائی جانے والی کشیدگی اور تناؤ پوری پوری متاثرہ آبادی کے اعصاب کو کمزور کر کے انہیں نفسیاتی مریض بنا دیتی ہے۔ متحدہ ریاست ہائے امریکہ سرد جنگ کا محور رہا ہے اور اسی ملک میں سب سے زیادہ نفسیاتی مریض پائے جاتے ہیں۔

انسان کا امن کا خواب بہت قدیم ہے۔ جتنا قدیم طبقاتی معاشرہ ہے۔ کیونکہ طبقات کے وجود میں آنے سے قبل قدیم اشتمالی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ اتنا تشدد پایا جاتا تھا، کہ ایک انسانی گروہ دوسرے گروہ کو اپنی شکارگاہوں میں نہیں گھسنے دیتا تھا۔ موہنجوڈارو میں جنگ کے کوئی ہتھیار نہیں ملے۔ صرف رقاصہ ملی ہے۔ طبقاتی معاشرے کا انسان امن کا صرف خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ مفادات کے ٹکراؤ میں جنگیں ناگزیر ہیں۔ دورِ حاضر میں سوشلسٹ نظام کے قیام کے بعد اس کی گنجائش پیدا ہوئی ہے کہ کم از کم عالمی اور نیوکلائی جنگوں کو بتدریج انسانی زندگی سے خارج کر دیا جائے۔

سوشلسٹ معیشت کی بنیاد پُرامن منصوبہ بند پیداوار ہے۔ منصوبہ بندی کا تصور ہی دنیا کو سوشلسٹ نظام کی دین ہے۔ سرمایہ دار نظام کمپنی کی آمدنی میں یا انفرادی کارخانے میں تو منصوبہ بندی کا قائل ہے مگر معاشرے میں جنگل کا قانون نافذ کرتا ہے۔ جس میں نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے۔ اس کی منصوبہ بندی کی معراج خاندانی منصوبہ بندی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سوشلسٹ ممالک کی منصوبہ بندی کی مثال کو دیکھ کر اب بہت سے غیر سوشلسٹ ممالک بھی اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج دنیا میں سوشلزم اور سرمایہ داری دونوں قائم ہیں۔ سوشلسٹوں کو اس میں بھی شک نہیں کہ وہ دن آئے گا۔ جب ساری دنیا میں سوشلسٹ نظام پایا جائے گا۔ لیکن ان کی خواہش ہے کہ ایسا جنگوں کے ذریعے نہ ہو۔ اکتوبر انقلاب کے بعد لینن نے ٹراٹسکی کی اس رائے کو رد کر دیا تھا کہ ہمیں سارے یورپ میں انقلاب برپا کرنے کے لئے جنگ کرنی چاہئیے۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ ہم سوویت روس میں سوشلسٹ معیشت تعمیر کریں گے اور اپنی کارکردگی کی مثال کی قوت سے دنیا کو متاثر کریں گے۔

مثال کی قوت بجائے ہتھیار کی قوت کے بات مساوی ہے۔ لیکن کس طور معنی خیز ہے۔ مثال بمقابلہ ہتھیار۔ ہتھیار سے لوگوں کو مغلوب کیا جا سکتا ہے غلام بنایا جا سکتا ہے، خوف زدہ کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کا جسم تو جیتا جا سکتا ہے لیکن دل نہیں جیتا جا سکتا۔ مثال کی قوت انسانی دلوں میں محبت کے تار چھیڑتی ہے۔ تقلید کر کے انسان انسان بنا ہے۔ تقلید یا مثال کی تقلید اس کے لئے فطری ہے۔ وہ مثال کی قوت سے بھی ہزاروں سال سے واقف ہے۔ وہ دنیا کا کون سا حصہ ہے۔ جہاں لوگوں نے اپنے کو بہتر بنانے کے لیے مرید اور پیر و مرشد کا طریقہ کار ایک یا دوسری شکل میں قائم نہ رکھا ہو؟ اب بھی ہم میں سے اکثر کسی نہ کسی شخص

انسان کا امن کا خواب بہت قدیم ہے

کو اپنا IDEAL بنا لیتے ہیں۔ لیکن طبقاتی سماج میں یہ طریقہ کار انفرادی یا گروہی زندگی سے آگے بڑھ کر پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لینے کے لئے حالات سازگار نہیں ہوتا۔

سوشلسٹ نظام استحصال کی نفی کرتا ہے۔ وہ انسان پر انسان کے تسلط کی نفی کرتا ہے۔ وہ کسی ایک انسان کی نظر کسی دوسرے کے مال پر مرکوز کرنے کے بجائے اس کی داخلی، تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ ہمارے یہاں کہاوت ہے۔ کہ خربوزے کو خربوزہ دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ یہی تقلید اجتماعی زندگی کا جوہر ہے۔ یہی جذبہ اسے تخلیق، خدمت اور معاشرے پر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔ آج ہتھیار کی قوت اور مثال کی قوت کے درمیان ٹکراؤ جاری ہے۔ کچھ نیوکلائی ہتھیاروں کو تباہ کئے جانے کا معاہدہ مثال کی قوت کے لئے ایک چھوٹی لیکن بہت اہم کامیابی ہے۔ اس معاہدے کا پیغام یہ ہے کہ دو نظام اور دو نظریوں کے ماننے والوں میں ضرور جدوجہد ہو لیکن وہ جدوجہد تب ہی کر سکیں گے۔ جب دنیا تباہ نہ ہو جائے اور وہ جدوجہد کرنے کے لئے زندہ رہیں۔ سوشلسٹ پُرامن بقائے باہمی کے ماننے والے ہیں۔ اس لئے ان پر یہ حقیقت ہمیشہ واضح رہی ہے۔ لیکن حال میں سوویت یونین نے جو جمہوری اقتدار کو زیادہ جامع بنانے کی تحریک چلا رہی ہے۔ تاکہ عوام کی پیداواری اور تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارا جا سکے اور جس کو دنیا پروسترائکا کے نام سے جانتی ہے۔ اس کی وجہ سے سوویت یونین نے زیادہ

حقیقت پسندانہ تجاویز پیش کرکے INF کی کامیابی حاصل کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ معاہدے کے مثبت اثرات ہمارے خطے اور ملک کی جمہوری تحریک پر بھی پڑیں گے۔ پہلی بات یہ ہے کہ سامراجی جبر اقتصادی ہونے کے باوجود اس کا دارومدار فوجی طاقت پر ہوتا ہے۔ ہمارے خطے میں فوجی اڈے اسلحہ کی درآمد وغیرہ سب اگلے وقتوں کی گن بوٹ ڈپلومیسی کی نئی شکلیں ہیں۔

مجھے وہ واقعہ یاد آرہا ہے جب برطانوی نمائندے شاہ مصر کے دربار میں حاضر ہوئے اور اپنے نامعقول مطالبے بڑے مہذب انداز میں پیش کئے انہیں ماننے پر شاہ مصر مجبور تھے۔ کیونکہ دربار کے در سے دریائے نیل پر برطانوی گن بوٹ نظر آرہے تھے۔ سرد جنگ اور نیوکلائی ہتھیاروں میں کمی ہونے پر ہم پر نئے نوآبادیاتی چنگل کمزور پڑیں گے اور جمہوری عناصر کے لئے امکانات روشن ہوں گے دوسری بات یہ ہے کہ کچھ سرکاری مولوی اور دیگر رجعت پسند دل کا یہ بے بنیاد پروپیگنڈہ کہ جنگ انسان کی فطرت کا حصہ ہے جنگ کے بغیر ان کے نئے غازی اور شہید کے تصورات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ بالکل غلط ہے اب حضرت انسان آپس میں جنگ کرنے کے بجائے تسخیر فطرت کے لئے جہاد کر کے غازی اور شہید کے تصورات کو نئے معنی دینے کی راہ پر گامزن ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ رجعت پرست حکمرانوں کی عوام میں منافرت کی ہوا دینے کی سیاست جو عوام میں پھوٹ ڈالنے کے لئے ضروری ہے۔ کمزور پڑے گی۔ بیروت اور کراچی جیسے شہروں میں مختلف گروہوں کے درمیان کشیدگی اور مسلح تصادم لوگوں کو اور بڑی جنگوں کو نفسیاتی طور پر قبول کرنے کی طرف لے جاتے ہیں۔ انھیں یہ درس دیتے ہیں کہ منافرت عین فطری ہے اور غلبہ صرف ہتھیاروں سے ممکن ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ دنیا کو دو متضاد اور متصادم کیمپوں میں بانٹنے رجحان کم ہوگا۔ امریکی سیکریٹری شولتز نے جب ریگن گورباچوف ملاقات کو دو حریفوں کی ملاقات کہا یا ریگن نے رنگ میں دو باکسروں کی ملاقات سے تشبیہہ دی تو وہ ایسا نظریہ پیش کر رہے تھے جس سے طبقاتی سماج ہزاروں سال سے واقف ہے۔ ان کے برعکس جب گورباچوف نے اپنی ریگن سے ملاقات کو دو دوست ممالک کے سربراہوں کی ملاقات کہا تو یہ ایک نیا زاویہ نظر تھا جو انتہائی صحت مند ہے۔ یہ پرسترائیکا کی دین ہے۔ ہمارے حکمران بھی پاکستان کو کراچی یا اسلام آباد سے دیکھنے کے بجائے واشنگٹن سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ انہیں پاکستان سوشلسٹ ممالک سے ملحق نظر آتا ہے وہ اس کو فوراً فرنٹ لائن اسٹیٹ کہہ دیتے ہیں اور سوشلسٹ ممالک کے خلاف جھٹ امریکی جنگی منصوبوں میں شریک ہوجاتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ہی ملک کے کسی مقام سے ارد گرد نظر ڈالیں تو ہمیں اپنا ملک فرنٹ لائین یا بیک لائین نہ نظر آئے بلکہ وہ محض ہندوستان چین ... سوویت یونین، افغانستان، ایران اور امارات کا پڑوسی ملک نظر آئے۔ ہمیں یہ بھی نظر آئے کہ ہر ملک کے طور طریقے منفرد ہونے کے باوجود سبھی ایک دوسرے کے پڑوسی ہونے کے ناطے کچھ رشتے رکھنے پر مجبور ہیں۔ ہماری تہذیب بہت قدیم ہے اور ہمارے لوگ پاس پڑوس میں رہنے والوں کے تقاضوں اور ہمارے ان کی طرف فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔ آج کے سیمینار کے منتظمین نے مقرروں کو پیش بینیوں کی دعوت دی ہے۔ میں اس کا مطلب یہ سمجھا کہ محترم میزبانوں کی خواہش ہے کہ زیر نظر INF کا معاہدہ مستقبل بعید کے جن رجحانات کو تقویت دیتا ہے ان کی تشریح کی جائے میری عرض ہے کہ یہ معاہدہ ہمیں اس معاشرے کی طرف لے جانے والا ایک قدم ہے جس میں لوگ محنت کو بیگار یا مشقت کے طور پر نہیں دیکھیں گے بلکہ وہ محنت زندگی کی لذت حاصل کرنے کے لیے کریں گے۔ یہ معاہدہ اس دور کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب سماج دشمن اقوام جرم کی بجائے بیماری کے طور پر دیکھیں جائیں گے اور سزائے موت ماضی کی ایک ناخوشگوار یاد بن جائے گی۔ ہم اس دور کی طرف بڑھ رہے ہیں جب انسان مباحثوں کے ذریعہ باہمی جدوجہد کرے گا اور اس کی مزید ارتقائی عمل کی بنیاد فطرت کے قوانین کی دریافت کی جدوجہد ہوگی۔ یہ سب فی الحال ہمیں آپ کو خواب نظر آتے ہیں لیکن یقین رکھیے کہ یہ وہ خواب ہیں جو کل ضرور حقیقت بنیں گے۔

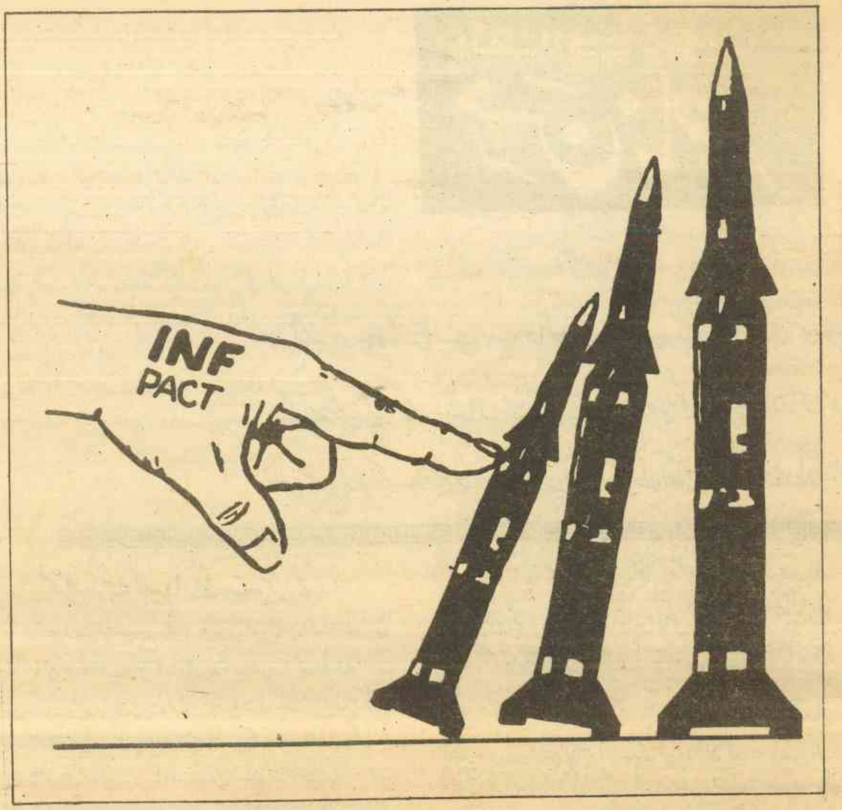

■ جنیوا پروٹوکول ۱۹۲۵ء: اس معاہدے پر ۱۰۶ ملکوں نے دستخط کیے تھے۔ اس معاہدے کا مقصد زہریلی گیس، زہر کے استعمال اور جراثیم پھیلانے والے کیمیاوی ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی عائد کرنا تھا۔ عراق (جس نے اس معاہدے پر دستخط کیے تھے) نے ایران کے خلاف جنگ میں متعدد بار کیمیاوی ہتھیاروں کا استعمال کرکے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی۔

■ جنیوا کنونشن ۱۹۴۹ء: ایک سو اکسٹھ (۱۶۱) ملکوں نے اس معاہدے پر دستخط کیے، جس کی رُو سے جنگ کا شکار ہونے والے، دورانِ جنگ زخمی، بیمار یا گرفتار ہونے والے سپاہیوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔

■ انٹارکٹک ٹریٹی ۱۹۵۹ء: اکتیس ملکوں نے انٹارٹک کے علاقے کو غیر فوجی اور پُرامن مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا عہد کیا۔

■ پارشل ٹیسٹ بین ٹریٹی (PTTB) ۱۹۶۳ء: اس معاہدے پر ایک سو بارہ ملکوں نے دستخط کر کے یہ عہد کیا کہ فضا، خلا، زمین یا سمندر میں کسی بھی قسم کے جوہری تجربات نہیں کیے جائیں گے۔

■ آؤٹر اسپیس ٹریٹی ۱۹۶۷ء: اس معاہدے پر پچاسی ملکوں نے مشترکہ طور پر دستخط ثبت کیے ہیں، جس کی رُو سے بیرونی خلا، چاند یا دیگر سیّاروں پر کسی بھی قسم کے فوجی یا جوہری تجربات کرنے اور کسی بھی قسم کے تباہ کاری کرنے والے ہتھیاروں کے رکھنے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

■ ٹریٹی آف ٹلاٹیلولو ۱۹۶۷ء: ۲۳ ملکوں نے یہ عہد کیا کہ لاطینی امریکہ کے ممالک ایٹمی تجربات، کرنے، انہیں بنانے، ذخیرہ کرنے، ان کی تنصیب کرنے یا انہیں کسی بھی دوسرے ذریعے سے حاصل کرنے سے گریز کریں گے۔

■ اینمو ڈکنونشن ۱۹۷۷ء: یہ معاہدہ ماحولیات سے متعلق ہے۔ اس میں کسی بھی ایسے فوجی یا غیر فوجی تجربے یا تحقیق پر پابندی عائد کی گئی ہے جس کے نتیجے میں زمین، فضا، سمندر، یا زیرِ زمین اور زیرِ سمندر نیز خلاء کا قدرتی اور فطری ماحول متاثر ہوتا ہو۔

■ انہیومن ویپن کنونشن ۱۹۸۱ء: اس کنونشن کے دستخط کنندگان کی تعداد چوبیس ہے۔ اس معاہدے کا مقصد مختلف ملکوں کے درمیان پروٹوکول معاہدوں کی گنجائش پیدا کرنا ہے تاکہ ایسے خطرناک روایتی ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی عائد کی جاسکے جو انتہائی مہلک اور ضرر رساں ہوتے ہیں۔

انقلابی شہید
حسن ناصر

احسن علی مرزا

۱۳ر نومبر وہ سیاہ تاریخ ہے جب ظالموں نے برصغیر کے عظیم انقلابی حسن ناصر کو بدترین اذیتیں دینے کے بعد شہید کیا۔ نومبر کے اس مہینے میں اس شہید کو یاد کرتے ہیں اور اس موقع پر حسن ناصر کی والدہ محترمہ زہرہ علمبردار کا ایک انٹرویو، سید سبط حسن کا ایک مضمون اور حسن ناصر کے دو یادگار خطوط پیش کر رہے ہیں۔

محترمہ زہرہ علمبردار ایک انٹرویو

کسی ایسی الم نصیب ماں سے جس کا بیٹا بھری جوانی میں مارا گیا ہو اور وہ ایسے کہ اس کی مرقد تک کا پتہ نہیں، اسی مقتول کے بارے میں بات چیت کرنا زخم کریدنے کے مترادف ہوتا ہے جب حسن ناصر شہید کی والدہ محترمہ جنہیں ہم سب "زہرہ آپا" کے نام سے مخاطب کرتے آئے ہیں سے ملاقات کے ارادے سے چل پڑا تو یہی خیال آ رہا تھا کہ جس سانحہ کو برسوں گزر گئے اس کی یاد دلانے سے ان پر کیا کچھ نہ گزرے گی۔ گھر پر ناصر میاں کے مرحوم اباجان کے نام کی تختی امتداد وقت کا گلہ کر رہی ہے جس شخص کا وجود ہی نہیں رہا اس کے نام میں کیا دھرا ہے۔ لیکن کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو متعلقہ جسم سے الگ ہو کر بھی اپنے دائمی وجود کا لوہا منوا لیتے ہیں۔ جناب علمبردار جنہیں حسن ناصر غالباً "سید صاحب" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آج اپنے اسی بیٹے کی شہادت کی بنا پر مرگ بدن کے باوجود جان کی موت سے دوچار نہیں ہو سکے جس کے انداز فکر سے ان کی طریقت و شریعت کے ٹکراؤ نے بڑی پیچیدہ صورت حال پیدا کر دی تھی۔ لیکن بعد میں انہوں نے سوچا ہوگا کہ ان کے بزرگ بدرالحسن بھی تو اپنے وقت کے حسن ناصر ہی تھے۔ زربفت و کمخواب کے ملبوسات اور درباداری کے دور میں بدرالحسن صاحب نے بھی تو کھادی کپڑے پہن کر ایک نئے فلسفہ حیات سے وابستگی کا رسمی انداز ہی میں سہی اعلان تو کیا تھا۔ حسن ناصر نے بھی "دین بزرگان" کو خوش کرنے کی روایات کا شیرازہ بکھیر کر ہتوڑے اور درانتی سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔

نئی نسل کے انحراف اور سرتابی کی کہانی ازل سے ابد تک سنی جاتی رہے گی۔ لیکن زہرہ آپا کو دیکھئے "حسن ناصر" کو لاہور کی گود میں ابد کی نیند سوتا چھوڑ کر آئی ہیں۔ مملکت اسلامیہ پاکستان" کی سرکار عظمت مدار نے ان کے بیٹے کو صرف اس پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دیا کہ وہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا۔ ہندوستان کے ایک اعلیٰ گھرانے کی اس خاتون کا تصور کیجیے جو اپنے بیٹے کی مرگ مفاجات کی غیر مصدقہ خبر سن کر یکہ و تنہا کراچی پہنچ جاتی ہے۔ انہیں کی زبان سے "اس وقت پاکستان میں کسی کمیونسٹ کہلائے جانا بھی اس کی موت کا سبب بن سکتا تھا"

کراچی کے ہوائی اڈے پر اترنے والی اس سبک اندام شائستہ مہذب اور تعلیم یافتہ ماں کو جو اپنے لخت جگر کی نعش اپنے شہر حیدر آباد کو لانے کے لیے آئی تھیں طیارے کا ہی سے ایوب شاہی کے خفیہ ایجنٹوں، فوجیوں اور پولیس کی ایک بٹالین نے اپنے نرغہ میں لے لیا۔ "زہرہ آپا" بڑے پروقار انداز میں اپنے اس سفر کراچی کی داستان رہی تھیں، میں اور امجد بھائی تصویر حیرت بنے اس ماں کو دیکھ رہے تھے جو بڑے فخر و انکسار سے مسکراتی ہوئی کہتی ہے "مجھے اپنے بیٹے پر ناز ہے۔ جھوٹ سے اسے نفرت تھی۔ اس نے کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں کی۔ وہ ارباب پاکستان کو بھی اپنے بارے میں سچی باتیں بتاتا رہا۔ عدالت میں پولیس میں ہر جگہ اس نے وہی کہا جو اس کے ضمیر کی آواز تھی۔ وہ راسخ العقیدہ کمیونسٹ تھا اور اس نے کسی بھی مرحلہ پر اپنے اصول اور اپنے نظریہ پر آنچ نہ آنے دی"۔

میں نے حسن ناصر کے معرکہ حق کی بکھری ہوئی کڑیاں جوڑ کر اسے مربوط بنانے کی کوشش کی اور پوچھا۔

"زہرہ آپا حسن ناصر نے شاید اسی گھر میں جنم لیا تھا؟"

"نہیں تو" آپا بولیں" وہ عابد منزل ترپ بازار میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے سینٹ جارجس اسکول اور نظام کالج میں تعلیم پائی اور پھر ایف اے میں داخلہ لینے علی گڑھ چلا گیا۔

حسن ناصر شہید کا بچپن میری آنکھوں میں پھرنے لگا زہرہ آپا ایک لمحہ کے لیے رک گئیں اور اسی اثنا میں زہرہ آپا کی بڑی بہن امیر خالہ کافی کی ٹرے لیے اس حصے میں آپہنچیں جہاں ہم زہرہ آپا سے باتیں کر رہے تھے۔

.. امیر خالہ نے مجھے برسوں پہلے دیکھا تھا، مادرانہ شفقت سے پوچھنے لگیں "تم اتنے دبلے پتلے کیسے ہو گئے" ایک لمحہ کے لیے خیال کی رو ٹوٹ گئی اور زہرہ آپا بغلی کمرہ میں رکھی ہوئی الماری کا ڈیسک کھول کر حسن ناصر کی ایک یادگار تصویر لے آئیں۔ ننھا منا حسن ناصر، انار کی کی طرح چمکتے دانت خوبصورت بال، گورا چٹا۔ ایک اور تصویر بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ زہرہ آپا بولیں" یہ دوسری تصویر اس کے قتل سے صرف چند ماہ پہلے کی ہے"

حسن ناصر سیاہ رنگ کی جرسی پہنے ہوئے مسکرا رہے، پیشانی پر عزم محکم کے آثار زہرہ آپا بجنسہ متانت سے کہے جارہی تھیں "ذرا اسے دیکھئے آپ! قد آور لمبا تڑنگا۔ پاکستان والوں نے مجھے ایک چھوٹے قد کی نعش دکھا کر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ ناصر کی نعش ہے۔ مجھے ڈرایا دھمکایا گیا۔ قبر سے نعش نکلوانے کی جو اجازت میں نے ہائی کورٹ سے حاصل کی تھی۔ اسے ٹال دینے کے لیے عفونت کا ذکر کیا گیا۔ میانی قبرستان میں ڈھاٹے باندھے گورکنوں کو اب تک بھول نہیں پاتی ہوں۔ لیکن میں ڈری نہیں میں نے نعش کے پاؤں کھول کر دیکھے۔ ناصر کو بچپن میں ایک چوٹ آئی تھی اور اس کا نشان اس کے پاؤں پر رہ گیا تھا۔ مجھے جو نعش دکھائی گئی اس پر وہ نشان نہیں ملا۔ میں نے اس نعش کو اپنے بیٹے کی نعش ہونے سے انکار کر دیا۔

... اور پھر ایک اجنبی میرے کان میں چپکے سے کہہ گیا۔

"ماں تمہیں دھوکہ دیا جا رہا ہے"!

زہرہ آپا ... شہید ناصر کی ماں بن کر کتنی عظیم ہو گئی ہیں۔ ان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں ان سے بات چیت کا شرف حاصل ہوا ہے ... انہیں اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ ان کا بیٹا مرا نہیں ہے بلکہ اس نے موت کو نیچا دکھایا ہے یہی کیا کم ہے اس کی وفات کے دس بارہ برس بعد آج محبان وطن اس کی یاد منا کر اس امر کا اعتراف کر رہے ہیں کہ اس کا نام ہی سرچشمۂ وجدان ہے ... زہرہ آپا اس وقار اور متانت سے اپنے عظیم بیٹے کی باتیں سناتی رہیں۔ بچپن میں کیسا تھا وہ! کس طرح سینٹ جارجس گرامر اسکول نے اس کی انگریزی کو قابل رشک قرار دیا تھا۔ میں نے بعض پاکستانی اخبارات کے حوالے سے پوچھا کہ آپ کے کوئی بھائی کراچی میں رہتے ہیں اور کیا یہ درست ہے کہ اپنے بھانجے کی اطلاع پانے کے بعد بھی انہوں نے اس نعش کے حصول کی کوشش نہیں کی۔

زہرہ آپا بولیں جی ہاں میرے ایک بھائی کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ بہت کمزور دل کے واقع ہوئے ہیں۔ میں نے کراچی جانے

کے بعد ان سے پوچھا تو ان کی بیوی کلنے بتایا کہ ناصر کے انتقال کی خبر سن کر ان پر نروس بریک ڈاؤن کا شدید حملہ ہوا۔ وہ رات بھر بے چین و بے قرار رہے اور پھر سبھوں نے یہ سوچا کہ مرگ ناصر کی نعش دیکھ کر ان کا کیا عالم ہوگا۔۔۔۔

بہر حال یہ درست ہے کہ انہوں نے ناصر کی نعش کے حصول کی کوشش نہیں کی۔"

روئے سخن بدل کر زہرہ آپا کہنے لگیں کراچی چلے جانے کے بعد بھی ناصر مجھے برابر خطوط لکھا کرتا تھا۔ البتہ اس کی روپوشی کے دوران اس کے خطوط بہت کم آیا کرتے تھے ان خطوط میں وہ سب کا حال چال پوچھتا بچہ بچہ کو دعا سلام لکھتا اور پھر اپنے پسندیدہ سیاسی نظریہ پر اپنے غیر متزلزل ایقان کا اظہار کرتا۔

زہرہ آپا جیسے گزری باتوں کی کڑیاں جوڑتی جارہی تھیں لیکن اس داستان کی بے پایاں وسعت بھی وہ ایک بات کا ذکر کرتیں تو دوسری ہزاروں باتیں یورش کر دیتیں جن ہاتھوں نے ناصر کے "گہوارہ" کی ڈوری سنبھالی تھی ان کی انگلیاں ننھے منے ناصر کے گالوں کی نرمی کی یاد دلا رہی تھیں جن آنکھوں کو اس کا سہرا دیکھنے کی آرزو تھی۔ انہیں اس کے آخری دیدار سے بھی محروم رہنا پڑا۔

ایک ماں کی حیثیت سے زہرہ آپا کو اپنے ناصر کا غم بھلانے میں کتنے دن ہوں گے اور کتنے آنسو پینے پڑے ہوں گے۔

اس کا حال تو وہی جانتی ہیں لیکن ہم سے بات چیت کے دوران نہ تو ان کی آواز بھرائی اور نہ ان کی آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپکا ایک شہید کی ماں بننے کے اعزاز و افتخار نے ان کو کتنی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔

زہرہ آپا ۱۹۵۴ء کے دن کو یاد کرنے لگیں جب کہ وہ کراچی گئی تھیں انہوں نے کہا "اس وقت وہ جیل میں تھا لیکن جیل کا کرسچین سپرنٹنڈنٹ بڑا شریف آدمی تھا اس نے ناصر کو ہفتہ میں دو بار گھر سے کھانا بھیجنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ کھانا برابر جایا کرتا تھا لیکن ایک دن کھانا واپس ہو گیا ہم سبھوں کو تشویش ہوئی لیکن دریافت حال پر پتہ چلا کہ وہ لاہور جیل منتقل ہو گئے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد وہ ۱۹۵۵ء ہی میں اپنی خالہ محترمہ امیر النساء بیگم کے ساتھ حیدر آباد آئے۔ پاکستان حکومت نے یہ سوچ کر انہیں حسن ناصر سے نجات مل جائے گی انہیں ملک بدر کر دیا اور وہ حیدر آباد آگئے۔ ۱۹۵۶ء تک وہ یہیں رہے اور دوبارہ پاکستان کو واپسی پر انڈر گراونڈ ہو گئے اور پھر گرفتاری کے لیے روپوشی یا گرفتاری اس میں اس کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا۔۔۔

انہوں نے بتایا کہ ۱۵ر نومبر ۱۹۶۰ء کو ناصر کے دوست اسحاق محمد کو کراچی جیل میں ناصر کے انتقال کی خبر ملی اور ۱۷ر نومبر کو انہیں حیدر آباد میں اس سانحہ کا علم ہوا۔ اپنے انٹرنیشنل پاسپورٹ پر ضروری اندراجات پر دیر نہ لگی اور وہ تین چار دن ہی میں کراچی روانہ ہو گئیں اس اثناء میں انہوں نے ہمارے ہائی کمشنر متعینہ کراچی سے بذریعہ ٹیلیگرام درخواست کی کہ وہ اس خبر کی حکومت پاکستان سے توثیق چاہیں۔ لیکن انہیں بتایا گیا کہ ناصر نام کا کوئی شخص کراچی جیل میں نہیں تھا حسن ناصر کے دوست احباب نے عدالت میں رہائی از حبس بیجا کی درخواست پیش کر دی اور مسٹر محمود علی قصوری نے درخواست کی کہ وہ حسن ناصر کو حاضر عدالت کرنے کے احکام جاری کرے۔ احکام جاری ہوئے تو ارباب مجاز نے بتایا کہ حسن ناصر بہت بیمار ہیں۔ عدالت نے انہیں اسٹریچر پر لانے کی ہدایت کی اور جب پولیس سے کوئی اور بہانہ بن نہ پڑا تو بتایا کہ حسن ناصر نے خودکشی کر لی ہے۔

زہرہ آپا قدرے بلند آواز میں کہنے لگیں "میں نے عواقب و نتائج کا خیال کیے بغیر پولیس کے اس بیان کی تردید کی۔۔۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ حسن ناصر خودکشی تو بہر حال نہیں کر سکتا وہ مجھ سے پوچھنے لگیں، کیا تم اس بات کو باور کر سکتے ہو۔"

ایوب شاہی کے اس کالے کارنامے کی روئداد کتنی لرزہ خیز ہے۔ اس ملک کے حکمرانوں کی دہشت و درندگی کی یہ داستان کتنی المناک ہے لیکن اسی پاکستان میں زہرہ آپا کے ہمدردوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مزدور طلباء محنت کش لوگ۔ پاکستان کی مائیں بیٹیاں غرض کتنوں نے پاکستان کے اس نوجوان کی ماں کا ساتھ دیا جو پاکستان کے حکمرانوں کی نظر میں باغی تھا۔ زہرہ آپا محسوس کرتی تھیں کہ ان لوگوں کے لیے یہ ہمدردی مہنگی پڑے گی۔ کمشنر کے اجلاس پر جیل میں، عدالت میں، یہاں تک اس قبرستان میں جہاں زہرہ آپا کو ایک دوسری نعش یہ کہہ کر دکھائی گئی تھی کہ یہ ان کے بیٹے کی نعش ہے۔ پاکستان کے ان لوگوں نے انہیں گھیر لیا تھا جنہیں جنگ کے ہولناک دور میں بھی سردار جعفری نے بڑے پیار سے بلایا تھا۔

آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر

حکمرانوں نے متعدد مرتبہ آگ و خون کی ہولی کھیلی ہے لیکن پاکستان کے عوام وہ بھی تو صدیوں کے تہذیبی رشتوں کو توڑ نہیں پائے ہیں۔ دہلی میں کوئی حادثہ ہو تو نہ جانے کتنی پاکستانی بہنیں اپنے ان بھائیوں کی خیر منائی ہوں گی جو ہندوستان میں ہیں اور پھر خود اپنا بھی کیا عالم ہے۔ کراچی لاہور پاکستان کا کونسا شہر ہے جہاں ہمارے عزیز و اقارب نہیں۔ حسن ناصر کی طرح پاکستان کے ان عام لوگوں نے بھی ایک مرحلہ پر ایوب شاہی کے خلاف بغاوت کر دی جس نے پاکستان کے کئی محبان وطن کا خون پی رکھا تھا۔

زہرہ آپا نے اسکندر مرزا کا دور بھی دیکھا تھا جب کہ وہ دمشق سے واپس ہوتے ہوئے کراچی میں ٹھہر گئیں لیکن ان دنوں ناصر انڈر گراونڈ تھے اس لیے انہوں نے وہاں سے جلد چلا آنا مناسب سمجھا تاکہ ماں سے ملنے کا جذبۂ بے اختیار ناصر کو پولیس کی حراست میں نہ پہنچا دے۔ اسکندر مرزا تاج و تخت سے محروم ہو کر لندن کے ایک ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔

ایوب خان نے ان کی جگہ سنبھالی، اور ظلم کی چکی پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ زہرہ آپا کو ناصر کی محبت اس دور میں بھی پاکستان لے گئی اور اسی منحوس گھڑی انہیں اپنے ہنستے مسکراتے جواں سال لڑکے کی بجائے ایک سڑی گلی بدنصیب نعش دکھائی دی۔

زہرہ آپا۔ ان سب منازل سے گزر کر بھی کس درجہ سلیم الطبع ہیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے بیٹے کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ وہ جانتی ہیں کہ جس "نظام حیات" کی آرزو میں کامریڈ حسن ناصر نے جان دی وہ اب ساری دنیا کا مستقبل بن گیا ہے۔ اس نظام حیات کے مخالفین نے کتنے سر نہیں کاٹے، کتنی ماؤں کی گودیں نہیں اجاڑیں کتنے گھروں کو بے چراغ نہیں کیا۔ ......

.... کتنے ہٹلر، کتنے مسولینی کتنے ایوب خان نہیں اٹھے اور کتنے بلند و بانگ دعوؤں سے نہیں اٹھے کہ وہ کمیونزم کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ لیکن سروں کی لاتعداد فصلیں کاٹنے کے بعد بھی سرخ پرچم برابر سرفراز و سربلند رہا ہے اس کی سرخی کو حسن ناصر کے خون نے بھی نئی آب و تاب بخشی ہے اور اسی پاکستان میں آج پھر ایک بار مزدوروں، کسانوں اور طلباء کے قدم اسی سمت بڑھ رہے ہیں جسے مملکت اسلامیہ پاکستان کے طرحدار حکمرانوں" نے راہ ممنوعہ قرار دیا تھا۔

زہرہ آپا۔ اسی حقیقت کا ایک سمبل ہیں۔ ان کے بیٹے نے اپنی جان دے کر خود انہیں اس نئے نظام حیات کو سمجھنے کا موقعہ دیا جو قتل و خون جنگ و غارتگری کے بجائے انقلابی انسانیت دوستی کی تعلیم دیتا ہے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زہرہ آپا اقبال کا یہ شعر دہرا رہی ہیں

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

حسن ناصر شہید کے ۲ دو یادگار خطوط

ماں کے نام

کراچی جیل ۶ جون ۱۹۵۳ء

پیاری امی!

امیر خالہ کا کراچی آنا کئی حیثیتوں سے سودمند ثابت ہوا سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان کا یہ دورہ آپ کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے چنانچہ انہوں نے مجھے وہ ساری چیزیں پہنچا دی ہیں جن کی مجھے سخت ضرورت تھی، کپڑے، چادریں دھوپ کا چشمہ اور ایک دستی گھڑی بھی، میں بھول گیا کہ انہوں نے مجھے ایک فاؤنٹین پن بھی فراہم کیا ہے اور میں اسی سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آپ کے تحفوں کو دیکھ کر میرے ساتھیوں نے کہا "یار! ایک ہی رات میں بورژوا بن گئے"۔ وہ کچھ بھی کہیں میں تو یہی چاہوں گا کہ آپ اور امیر خالہ تحفے اور تحائف کا سلسلہ جاری رکھیں۔ تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ فی الوقت مجھے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے

میرے نقطۂ نظر سے امیر خالہ کا آنا اس لحاظ سے بڑا مفید ثابت ہوا کہ انہوں نے میری رہائی کے لیے حکومت پاکستان سے متعدد مرتبہ نمائندگی کی۔ اب تک اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا ہے تاہم امیر خالہ کی دوڑ دھوپ میری رہائی کی مہم میں ایک نیا موڑ بن گئی ہے۔ میں نے پہلے ہی آپ کو لکھا تھا کہ میری رہائی از حبس بیجا کی درخواست سندھ کے چیف کورٹ میں پیش ہو چکی ہے۔ ابھی تک تاریخ آغاز سماعت کا تعین نہیں ہوا۔ غالباً چیف کورٹ میں میقاتی تعطیلات کے اختتام پر ایک مہینہ بعد اس کی سماعت شروع ہو گی دیکھئے آئندہ کیا ہوتا۔

آپ کو میرے بارے میں کسی قسم کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، جیسا کہ میں نے امیر خالہ سے کہا تھا کہ جو راستہ میں نے اپنایا ہے بالکلیہ اپنی مرضی سے اپنایا ہے۔ مجھے ایک اور زندگی ملے تو بھی میں اسی راستے پر چلتا رہوں گا۔ پوری نیک نیتی اور خلوص سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا اس پر نہ میں شرمسار ہوں اور نہ ہی آپ کو شرمسار ہونا چاہیے۔ مجھے تو اکثر یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ آپ میرے اس مؤقف کو اچھی طرح کیوں سمجھ نہیں پاتیں اس وقت میری عمر ۲۵ سال ہے اور میں ایک پختہ کار آدمی بن چکا ہوں۔ آپ کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مجھے بہر حال تحریک میں رہنا ہے۔ اسے چھوڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اپنے عزیز و اقارب اپنے خاندان اور آپ سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک سچے کمیونسٹ کی حیثیت سے ان رشتے ناطوں کو پہلے سے زیادہ قدر و احترام کی نظروں سے دیکھنے لگا ہوں اور اس دن کا منتظر ہوں جب کہ حیدرآباد آ کر میں آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر سکوں گا یقین کیجیے کہ کورٹ سے رہائی کے احکام ملتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ ایک بات جو بہ تمام ادب آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اب خاندان سے میرے روابط قدرے بلند سطح کے ہو گئے ہیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں اور دنیا کا کوئی فلسفہ اور کوئی منطق اس رشتے کو جھٹلا نہیں سکتا۔ اس اعتبار سے میری صحت کے متعلق آپ کی تشویش بالکل واجبی اور فطری ہے لیکن باور کیجیے کہ میری صحت ذرا بھی خراب نہیں۔ اس کی توثیق امیر خالہ نے بھی کی ہو گی۔ یہ درست ہے کہ پہلے کے مقابلے میں قدرے کمزور ہو گیا ہوں لیکن جیل میں اتنا تو ہونا ہی چاہیے۔ میں نے روزانہ ورزش کرنے کے علاوہ جسم پر تیل کے مساج کی عادت ڈال لی ہے اور اچھی غذا بھی کھانے لگا ہوں مجھے اُمید ہے کہ جلد میرے وزن میں قابل لحاظ اضافہ ہو گا۔ آپ اس وہم میں کیوں مبتلا ہیں کہ میں اپنی صحت و عافیت پر توجہ نہیں دیتا۔ پہلے کی لاپرواہی اب نام کو نہیں رہی ہے۔ کیوں کہ میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ عوام کی خدمت گزاری کے لیے صحت مند رہنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس خط کو پانے کے بعد آپ میری صحت کی فکر سے بے نیاز ہو جائیں گی۔

آپ کا چہیتا بیٹا
ناصر

بڑے بھائی کے نام

قلعۂ لاہور ۱۲ مئی ۱۹۵۲ء

ڈیر ممتاز

سیاسی مصلحتوں اور مجبوریوں کے تحت میں آپ کی شادی میں شریک نہیں ہو سکتا لیکن اس پُرمسرت تقریب کے سلسلے میں میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں میری آرزو ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی بے حد کامیاب رہے میں نے آپ کی ہونے والی رفیقۂ حیات کو دیکھا تو نہیں ہے لیکن میں بھولا نہیں ہوں تو وہ غالباً حیدر کی بہن ہیں اور حیدر میرا علی گڑھ کا پیارا دوست ہے مجھے پوری توقع ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے وفادار رہیں گے اور آپ کی ہونے والی بیوی ایک مثالی محبت کرنے والی رفیقۂ حیات ثابت ہو گی میری مبارکباد اپنی رفیقۂ حیات تک بھی پہنچا دیجیے۔ یہ صرف آپ کے لیے نہیں بلکہ وہ بھی اس میں برابر کی شریک ہیں۔ ۱۹ مئی کو سہرہ کے پھول کی خوشبو میں، مبارک باد پہنچانا بھول نہ جایئے۔ امی سے کہیے کہ وہ صرف اس لیے آنسو نہ بہائیں کہ میں شادی میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔ وہ جانتی ہیں کہ میں ان کے ساتھ ہی حیدرآباد آنے پر تیار ہو گیا تھا۔ لیکن ہم جو بھی چاہتے ہیں ضروری کہ ویسا ہی ہو۔ خود امی اس بارے میں مجھ سے کوئی شکایت نہیں کریں گی۔ میں تو یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ انہیں کراچی آ کر مجھ سے ملنے کی ہمت کہاں آ گئی تھی۔ سچ مانیئے کہ ان کی اس جرأت سے مجھے نیا حوصلہ ملا ہے۔ مجھے حیدرآباد چھوڑے بہت دن ہو گئے اس اثنا میں کیا کچھ تبدیلی نہیں ہوئی، انفرادی طور پر میں بھی بہت بدل گیا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی میں اپنے مشن کی تکمیل کرنی ہے، میں جس راہ پر چل پڑا ہوں اسے چھوڑنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ یہ راستہ میں نے اپنی مرضی سے اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ میرا یہ مشن آپ لوگوں سے میرے رشتے ناطے توڑنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ آپ سب بھی تو اس مدت میں کتنے بڑے ہو گئے ہیں کتنے بدل گئے ہیں۔ لیکن کیا آپ کا مجھ سے رشتہ منقطع ہوا؟ اس پس منظر میں شادی میں میری عدم شرکت پر ملول نہ ہوں۔ اس دن میری روح وہیں ہو گی بالکل آپ کے قریب۔ امی کو بھی یہی بات سمجھا دیجیے اور ان سے کہیے کہ وہ مسرت و انبساط کی ان گھڑیوں میں افسردگی کی جھلک پیدا نہ ہونے دیں

تمام تر محبتوں کے ساتھ
آپ کا بھائی ناصر

***

گام گام مقتل ہے.....!

حسن ناصر کی پہلی برسی پر

خالد علیگ

ساتھیو! دیدہ ور، ہم سفر و خوش نصیبو!
صحنِ زنداں کے رفیقو کوئی آواز تو دو

کوئی نغمہ، کوئی نوحہ کوئی آہنگ نہیں
کیسے فریاد ہو سودائے سرِ سنگ نہیں

میں کہ ایتھنز کے زنداں کی صدا ہوں یارو
پھر اندھیرے کے تعاقب میں چلا ہوں یارو

میں کہ آزادیٔ افکار کا سر نامہ ہوں
اپنے مدفن سے پھر اک بار نکل آیا ہوں

میں کہ احساس کے بیدار اجالے میں جیا
میں نے اک زہر بھرا جام بھی ہنس ہنس کے پیا

میں کہ پھر ارضِ اسرائیل کی آواز بنا
لحنِ داؤد بنا، نغمہ بنا، ساز بنا

سرِ ہستیٔ نفسِ کون و مکاں تک پہنچا
سر بہ سر حرفِ محبت تھا جہاں تک پہنچا

میں کہ تھا کشتۂ الفت مجھے مصلوب کیا
اہلِ دل ٹھیک کیا، اہلِ نظر خوب کیا

ذہن کے بند دریچوں پہ صدا دی میں نے
اپنے قاتل کو بھی جینے کی دعا دی میں نے

میں کہ اب قلعۂ لاہور سے ہوتا ہوں طلوع
پھر اسی وضع، اسی طور سے ہوتا ہوں طلوع

میں کہ ہر دور کی تہذیب کا معمار ہوں میں
پھر کسی خنجرِ قاتل کا طلب گار ہوں میں

میں کہ ہر عصر کی تہذیب کا سرمایہ ہوں
اپنے مقتل کی طرف آپ چلا آیا ہوں

قتل ہی میرا مقدر ہے تو پھر یوں ہی سہی
مجھ پہ شبِ خوں ہی ضروری ہے تو شب خوں ہی سہی

مجھ کو پھر دار پہ کھینچو کہ میں کچھ کہہ نہ سکوں
میں کہ سقراط ہوں، عیسیٰ ہوں، حسن ناصر ہوں

آمریت کے دور کا سب سے شرمناک سانحہ

سید سبط حسن

حسن ناصر کی پُراسرار موت کے راز کون افشا کر سکتا ہے۔ حسن ناصر نے قلعہ لاہور کے خانۂ معصیت میں جس طرح جان دی اسے کون بتا سکتا ہے۔ اس مردِ آہن پر اذیتوں کے کون کون سے حربے آزمائے گئے کسے معلوم؟ ہمیں تو یہ خبر بھی نہیں کہ حسن ناصر کا جنازہ کب اٹھا اور اس کو کہاں اور کس نے سپردِ خاک کیا۔ مگر وہ جوانی ہی کیا جو بسترِ مرگ پر دم توڑے وہ انقلابی ہی کیا جس کا سینہ ظلم کے سفاک تیروں کی آماجگاہ نہ بنے اور کیا لطف جنازہ اٹھنے کا ہر گام پہ گر ماتم نہ ہوا۔

حسن ناصر کی ناگہانی موت دورِ ایوبی کا شاید سب سے شرمناک سانحہ ہے۔ ایسا حادثہ کسی جمہوری ملک میں پیش آیا ہوتا تو ہر طرف تہلکہ مچ جاتا۔ اسمبلی میں سوال ہوتے، اخباروں میں احتجاجی بیانات چھپتے، اعلیٰ پیمانے پر عدالتی تحقیقات ہوتی اور مجرموں کو ان کی سیہ کاریوں کی قرار واقعی سزا ملتی۔ لیکن ہمارے ملک میں گنگا الٹی بہتی ہے چنانچہ قاتلوں کی سرزنش کے بجائے انہیں ترقیوں سے نوازا گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ترقیاں رسوائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اور جن شخص کے اشاروں پر یہ ستم توڑے گئے تھے وہ کرسیٔ اقتدار سے بہت بے آبرو ہو کر اٹھا۔ یہی حشر ان سبھوں کا ہوا جن کے ہاتھ حسن ناصر کے خون سے آلودہ تھے اور حسن ناصر اب بھی زندہ ہے اس کی درویشی اور دردمندی اس کے حوصلہ اور ہمت اس کی محبت اور وفا کیشی، اس کے خلوص اور ایثار کی داستانیں ہنوز ہمارے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہیں۔

حسن ناصر نازو نعم کی گود میں پلا تھا۔ حیدرآباد دکن کے جس خوشحال گھرانے سے حسن ناصر کا تعلق تھا اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ حسن ناصر ولایت میں اعلیٰ تعلیم پاتے اور واپس آکر بڑے عہدے پر فائز ہوتے اور اپنا گھر بساتے لیکن حسن ناصر کی حساس طبیعت نے اس زندگی کو قبول کرنا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ دولت اور محنت، ظلم اور انصاف اور جبر اور جمہوریت کی جنگ میں اس نے ان قوتوں کا ساتھ دینا مناسب سمجھا جو معاشرے کی تخلیقی صلاحیتوں کو آگے بڑھاتی ہیں اور محنت کشوں کا اقتدار قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں وہ زندگی بھر انہیں کے حقوق کے لیے لڑتا رہا اور بالآخر انہیں کی خاطر شہید ہوا۔

حسن ناصر سے میں پہلی بار بمبئی میں ملا تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۸ کا ہے رات کا وقت تھا۔ میں بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی لڑکا کھڑا تھا، پتلون اور بش شرٹ پہنے اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ ڈاکٹر ادھیکاری (جو ان دنوں روپوش تھے) نے آپ کو اسی وقت بلایا ہے چلیے۔ میں نے کہا اندر آجائیے میں تیار ہوتا ہوں۔ لڑکا اندر آگیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ انیس بیس برس کا نوجوان ہے البتہ اس کا قد مجھ سے اونچا ہے۔ سڈول جسم، بڑی بڑی روشن آنکھیں، گورا رنگ، کشادہ پیشانی ہنستا ہوا چہرہ۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں مسکرا مسکرا کر بولتا تھا۔ انگریزی کے فقرے انگریزوں کے انداز میں ادا کرتا تھا جس سے خیال ہوا کہ ضرور کسی کانونٹ اسکول میں تعلیم پائی ہے۔ البتہ اردو پر دکنی لہجے کی چھاپ تھی میں نے پوچھا کیا آپ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں اس نے اپنے حیدرآباد کے قیام کا ذکر کیا اور حیدرآبادی دوستوں کی بات چھڑی۔ بالخصوص مخدوم کی اور یوں محسوس ہوا گویا حجاب کی دیوار ختم ہو گئی۔ وہ کہنے لگے انقلابی ادب کا شوق مجھے مخدوم کی تقریریں اور نظمیں سن کر پیدا ہوا تھا اور اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سارا وقت اس تحریک کی نذر کر دوں میں نے اس بات کو جوانی کی امنگ سمجھ کر ایک کان سے سنا اور دوسرے سے اڑا دیا۔

چند ہفتوں کے بعد میں لاہور آگیا اور سیاسی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ مگر دو تین مہینے گزرے تھے کہ مجھے کراچی آنا پڑا یہاں میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ حسن ناصر سٹرپڈ کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ حسن ناصر سے یوں اچانک مل کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ وہ بھی حال ہی میں پاکستان آئے ہیں اور کل وقتی کارکن کی حیثیت سے پارٹی کا کام کر رہے ہیں۔ دوسرے دن جب وہ مجھے بستیوں میں لے گئے تو معلوم ہوا کہ اس امیرزادے نے تھوڑی سی مدت میں مزدوروں کو کس طرح اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ ایک روز وہ مجھے اپنے گھر لے گئے گھر کیا تھا مزدوروں کے احاطے میں ایک کھنڈر تھا جس کے دو کمرے ابھی تک سلامت تھے۔ ان میں بان کی تین چار پائیاں بچھی تھیں۔ ایک ٹوٹی سی میز تھی جس کے پائے اینٹوں کے سہارے کھڑے تھے۔ دو مونڈھے تھے اور ایک لالٹین۔ نہ پانی کا نل تھا نہ بجلی۔ تین چار کھونٹیاں تھیں جن پر صاف اور میلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے جب کھانے کا وقت آیا تو حسن ناصر کا ایک ساتھی بازار گیا اور نان شتہ والی میں دال اور روٹیاں لے آیا۔ چائے حسن ناصر نے خود بنائی۔ میں دل ہی دل میں ان نوجوان انقلابیوں کے جذبہ قربانی کی داد دیتا رہا۔ احساس کمتری کے باعث میں ان سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ اپنی تندرستی کا خیال رکھا کرو۔

چند ماہ بعد بنے بھائی (سجاد ظہیر) نے جو پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ بتایا کہ حسن ناصر کو مرکزی کمیٹی کا رکن بنا لیا گیا ہے (وہ مرکزی کمیٹی کا سب سے کم سن رکن تھا) مگر پاکستان کے سب سے بڑے شہر کی تنظیمی ذمہ داریاں اس کے سپرد کی گئی تھیں، اس کے بعد حسن ناصر سے ہر دو تین مہینے بعد ملاقات ہوتی لیکن ناصر اتنے کم سخن تھے اور سیاسی فکروں میں اتنے غرق رہتے تھے کہ ان کے ساتھ کھل کر باتیں کرنا ممکن نہ تھا۔ یوں بھی بڑوں کا ادب کرنا ان کی خاندانی روایتوں میں شامل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے ہماری دوستانہ بے تکلفی کبھی نہ ہو سکی۔

البتہ ۱۹۵۱ء میں جب ناصر قلعہ لاہور سے سینٹرل جیل میں (جو اب شادمان کالونی بن گیا ہے) منتقل ہو کر آئے تو ڈھائی مہینے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ بے سروسامانی کی زندگی، غذا کی خرابی اور اسیری کی صعوبتوں کے باعث ان کا معدہ بالکل خراب ہو چکا تھا۔ لیکن ان کو اپنی تندرستی کی بالکل پرواہ نہ تھی ساتھیوں نے ان کو بہت سمجھایا کہ یہ بڑی غیر انقلابی حرکت ہے۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہم لوگوں نے کھانے میں لال مرچ کا استعمال بالکل بند کر دیا۔ لیکن حسن ناصر کبھی کبھی لال مرچ کھا لیا کرتے تھے۔ آخر ان کی عمر ہی کیا تھی۔ احاطے میں آم اور جامن کے کئی درخت تھے۔ صبح سے دوپہر تک تو حسن ناصر کمرے میں بیٹھے کتابیں پڑھا کرتے۔ البتہ دوپہر میں جب لوگ کھانا کھا کر سو جاتے تو حسن ناصر کے اندر چھپا ہوا کھلنڈرا لڑکا جاگ اٹھتا اور حسن ناصر درختوں پر چڑھ جاتے۔ لال مرچ اور نمک کی پڑیا ان کی جیب پر پڑی رہتی اور وہ کیریاں کھاتے رہتے ان بد پرہیزیوں کے باوجود حسن ناصر کی صحت رفتہ رفتہ اچھی ہونے لگی تھی۔ ایک دن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آئے اور کہنے لگے کہ حسن ناصر صاحب اپنا سامان باندھیے۔ آپ واپس کراچی بھیجے جائیں گے۔ حسن ناصر کا چہرہ اتر گیا اور ہم لوگوں کو بڑا افسوس ہوا بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ یہاں تو ہم پانچ چھ لوگ ہیں جو حسن ناصر کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن کراچی جیل میں تو وہ بالکل اکیلا ہوگا۔ لاہور میں تو رفیقوں کے رشتہ دار کھانے پینے کی چیزیں اور دوائیں دے جاتے تھے مگر کراچی میں تو حسن ناصر کا کوئی عزیز رشتہ دار ایسا بھی نہیں جو اس سے مل جائے سامان بھیجنا تو درکنار۔ ہم لوگوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو تمام حالات بتائے اور کہا کہ آپ چاہیں تو حسن ناصر کا تبادلہ روک سکتے ہیں لیکن اس شقی نے ہماری بات نہ مانی اور مانتا کیوں سیاسی قیدیوں کی جاسوسی کر کے اور انہیں ستا کر تو اس نے انگریزوں سے خان صاحب کا خطاب پایا تھا اور اب اس قسم کی خدمات کے صلے میں انسپکٹر جنرل جیل بننے والا تھا۔ آخر حسن ناصر کی روانگی کا وقت آگیا اور ہم لوگوں نے اشکبار آنکھوں سے اسے رخصت کیا وہ ہاتھوں کے اشارے سے خدا حافظ کہتا رہا پھر جیل کے پھاٹک نے اسے ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ میں حسن ناصر کو پھر کبھی نہ دیکھ سکا۔

تعلیم یافتہ پاکستانی خواتین اور "مغرب زدگی" کی اصطلاح

پروفیسر وارث میر

فرائڈ اور ان کے ہم عصر اور ان کے بعد بعض دوسرے ماہرین نفسیات نے انسانی نفسیات پر بڑا کام کیا ہے لیکن عورت کی نفسیاتی شخصیت اور مستقبل میں اس کے امکانی کردار کے بارے میں کوئی سائنٹفک مربوط اور مبسوط مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ہیولاک ایلیس کی تحقیق اور کنسے رپورٹ بھی عورت کا ایک محدود مطالعہ ہے، مغربی معاشرے میں عورت، مرد کے دوش بدوش زندگی کی جدوجہد میں حصہ لیتی ہے اور اس "حصہ داری" کی بدولت عورت کی معاشرتی اور اقتصادی الجھنوں پر تحقیق ضرور ہوتی ہے اور تعلیمی و ثقافتی مراکز میں عورت کے مسائل پر مذاکرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ حقوق نسواں کی حمایت میں، سڑکوں پر مظاہرے کیے جاتے ہیں اور لٹریچر بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں، حقوق نسواں کی جنگ لڑتے ہوئے، مردوں کو ایک حریف طبقہ تصور کرتی ہیں، انھیں دعوت مبارزت دیتی ہیں اور ایسے مطالبات بھی کر دیتی ہیں جنھیں یورپ اور امریکہ کے معاشرے بھی آئندہ سو سال تک قبول کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ دنیا امریکی عورت کو، عصر حاضر کی آزاد ترین معاشرے کا حصہ سمجھتی ہے۔ لیکن عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف سب سے زیادہ تحریکیں بھی امریکہ ہی سے اٹھتی ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں امریکہ کی برکلے یونیورسٹی کیلیفورنیا میں، ہمیں خواتین کے مسائل پر ایک سیمینار کی کارروائی سننے کا موقع ملا تھا۔ شرکائے مذاکرہ میں سے بعض خواتین کو اولاد پر خاوندوں کے حق فوقیت پر شدید اعتراض تھا۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ امریکہ کی عورت کو، مرد کے مقابلے میں زندگی کی زیادہ ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں۔ وہ دفتر، اسکول، لیبارٹری، فیکٹری یا اسٹور میں کام کرنے کے بعد، گھر کو بھی سنبھالتی ہے اور اس کی سب سے بڑی ذمہ داری "بچہ" پیدا کرنا اور پھر اس کو پال پوس کر بڑا کرنا بھی ہے۔ لیکن بچے کو کس اسکول میں داخل کرایا جائے، اس کی پیشہ ورانہ تربیت کس نہج پر ہو؟ اسے کس قسم کا ماحول اور کیریئر مہیا کیا جائے۔ یہ تمام فیصلے باپ کرتا ہے یا ان فیصلوں پر باپ ہی اثر انداز ہوتا ہے حتیٰ کہ بچے کی خاندانی شناخت کے لیے بچے کے نام کے ساتھ باپ کا نام ہی لگایا جاتا ہے۔ یہ سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے۔ بنیادی طور پر، یہ تمام استحقاقات ماں کے ہیں، جو مرد کی جھولی میں صرف اس لیے ڈال دیے گئے ہیں کہ امریکی معاشرے کے اصلی مالک اور پالیسی ساز حکمران، سفید فام مردوں کے خفیہ استحصالی مفادات ہیں۔ واضح رہے، یہ شکایات کسی ایک ایسے ترقی یافتہ معاشرے کی عورتوں کی طرف سے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں بلند ترین مناصب حاصل کر سکتی ہیں۔ وہ اقتصادی طور پر خود کفیل ہیں اور شوہر کی وفات کے بعد، شوہر کے ترکے کی بلا شرکت غیرے مالک ٹھہرتی ہیں۔ چنانچہ امریکی مردوں کے بعض حلقوں کی طرف سے مبالغہ کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی نصف سے زائد قومی دولت پر عورتیں قابض ہیں۔ امریکہ میں سفید فام اور سیاہ فام امریکیوں کی چپقلش کا تو سب کو علم ہے لیکن مرد اور عورت کی معاشرتی کشمکش کی داستان کے اس حساس پہلو کا، ہمارے ہاں کم لوگوں کو علم ہے کہ سفید فام مردوں کے غلبے اور جبر کے خلاف سفید فام اور سیاہ فام عورتیں متحد ہیں۔ FEMINISM کی تحریک کے مفکرین کے نزدیک، امریکہ کا سیاہ فام مرد بھی تو سفید استحصال کے پنجے سے آزاد ہونے میں مصروف ہے چنانچہ اپنے آخری اور حتمی نتائج کے طور پر یہ تحریک سیاہ فام امریکی عورتوں کی نیم سوشلسٹ تحریک کا روپ دھار لیتی ہے۔ امریکہ میں یہ تحریک روز بروز جڑ پکڑ رہی ہے۔ یہ دلچسپ اور تہہ در تہہ تحریک ہے اس تحریک کا قدرے گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا جائے تو امریکی معاشرے کے بطن سے، مستقبل کے کئی فکری اور معاشرتی انقلابات پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

بیسویں صدی میں، حقوق نسواں کی اس جدوجہد کو دلیل اور منطق کی قوت فراہم کرنے میں، اہم ترین کردار ایک فرانسیسی خاتون سائمون ڈی بوائر (SIMONE DE BEAUVOIR) نے ادا کیا ہے۔ مادام بوائر ژاں پال سارتر کی ہم عصر تھیں، ان کے فلسفے سے متاثر تھیں اور "سیکنڈ سیکس" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ کر، اس عورت نے مغرب کی عورت کے ذہن میں پیدا ہونے والی بغاوت اور احتجاج کی آگ پر تیل ڈالنے کا فریضہ ادا کیا۔ اس نے عورت کو، اس کے روایتی اور بزدلانہ کردار پر شرم دلائی اور مردوں کو بھی خوب لتاڑا۔ نفسیاتی اور عمرانی علوم کے دست شناس ماہر جناب ایم اے ملک نے اپنی تازہ ترین کتاب "عورت کی نفسیات" (جو میری رائے میں، مرد ہی کے نقطہ نگاہ سے لکھی گئی ہے) میں مادام بوائر کی کتاب کے چند اقتباسات استعمال کرنے کی جرأت کی ہے اس کتاب کو پاکستان کی مادام کشور ناہید نے بھی اردو میں ڈھالا ہے۔ عورت کو غیرت دلانے اور اسے سماجی بندھنوں سے آزاد کرانے کے لیے بوائر نے جذبہ اور دلیل دونوں حربے استعمال کیے ہیں۔

مادام بوائر اس بات پر سخت نالاں ہے کہ عورت حقوق کی بات کیوں کرتی ہے؟ حقوق کیسے اور کس سے؟ حقوق ہمیشہ کمزور ناتواں طاقتور سے اور محکوم، حاکم سے بطور خیرات مانگتا ہے۔ بوائر کو امریکی عورت پر غصہ آتا ہے اور ترس بھی کہ وہ حقوق کے لیے مردوں کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ ان کے "پس خوردہ" پر پلتی ہیں اور مرد کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں انھیں روزی رساں سمجھتی ہیں اور شادی کے حصول معاش کا ذریعہ قرار دیتی ہیں۔ اسے ان لاکھوں غیر شادی شدہ خاتون کارکنوں کی قدامت پسندی پر بھی رونا آتا ہے جو یہ آس لگائے بیٹھی ہیں کہ کسی نہ کسی دن شادی انھیں غیر مرغوب، بیرون خانہ ذمہ داریوں سے نجات دلا سکے گی۔ وہ ان امریکی مردوں کی دقیانوسیت، تنگ نظری اور تعصب پر بھی سخت برہم ہے جو عورت کی سربراہی میں کام کرنے کو مردانہ شان کے منافی خیال کرتے ہیں۔ وہ پوچھتی ہے کہ بھلا ایسا کیوں ہے؟ مرد تو قائم بالذات ہے۔ وہ عورت کے بغیر اپنا تشخص رکھتا ہے تو عورت ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ وہ قائم بالذات کیوں نہیں؟؟ وہ سہارے کیوں ڈھونڈتی ہے؟ کیا وہ مکمل انسان نہیں؟؟ منفرد، آزاد، خود مختار اور اپنے الگ وجود کی مالک نہیں؟ بوائر کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ عورت جب حقوق کی بات کرتی ہے تو اس کا مطلب فقط "نسوانی حقوق" حاصل کرنا ہوتا ہے انسانی حقوق نہیں اسے مردوں کے بنائے ہوئے قوانین پر ذرہ بھر اعتبار نہیں کیونکہ مرد عیار ہے۔ وہ استحصالی قوتوں کا نمائندہ ہے۔ بورژوائی ذہن کا مالک ہے۔ نامعقول، دوغلا اور ناقابل اعتبار ہے۔ وہ لفظاً، عورت کو جو دیتا ہے، عملاً اس سے چھین لیتا ہے۔ یہ دنیا، جس میں عورت سانس لے رہی ہے۔ مردوں کی بنائی ہوئی ہے۔ مرد جسے چاہتا ہے اپنی اغراض کا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ مادام بوائر نے مرد قانون دان، مذہبی رہنماؤں، فلسفہ دانوں اور نفسیاتی ماہروں کی جانبداری کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔

اس کے نزدیک مردوں کے غلبے میں پروان چڑھنے والے معاشرے کے ظلم و ستم نے عورت کو جور پرست (MASOCHIST) اور مرد کو جور پسند (SADIST) بنا دیا ہے۔ بوائر نے عورت اور مرد کے بعض مخصوص حیاتیاتی تقاضوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کے باوجود، یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس نے موجودہ انسانی معاشرے کی عمرانی و تہذیبی قوتوں کو اس کے درست مناظر میں سمجھ کر، زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے کی بجائے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا ہے جبکہ یہ دو متحارب سیاسی یا فوجی قوتوں کا مقابلہ نہیں ہے یہ دونوں اصناف ایک ہی تصویر کے دو رخ اور ایک ہی دھارے کی دو موجیں ہیں۔ مغرب ہی میں ردعمل کے طور پر، بعض قلم کاروں نے ایسی کتابیں بھی لکھی ہیں جن کا موضوع، مرد کی مظلومیت ہے، اس استدلال کی رو سے عورت مرد کا استحصال کرتی ہے اور اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو، اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے بھڑانے یا رشتوں ناتوں کو درہم برہم کر دینے سے کوئی معاشرتی ڈھانچہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے مرد میں عورت کے مسائل اور زندگی میں اس کے بنیادی کردار کو بے تعصبی سے دیکھنے اور سمجھنے کا شعور پیدا کیا جائے اور عورت کو بھی اپنی ذات کے احترام اور اہمیت سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ، اسے اپنے حقوق کے حصول کے لیے سیاسی اور قانونی ہتھیاروں سے مسلح ہونے کا حوصلہ اور سلیقہ دیا جائے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں سیاست و مذہب کے اجارہ دار طبقوں نے، وقت کی آواز سے کانوں کو بہرہ رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے، وہ اپنے مفادات کے گنبد میں بند، اپنی ہی آواز کی بازگشت سن کر مطمئن رہنے کے عادی ہیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان کے تعلیمی میدان میں، عورت مرد کو پچھاڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ اخبارات و جرائد اور الیکٹرانک میڈیا نے پاکستانی خواتین کی نئی نسل کا رابطہ دنیا بھر کے معاشروں سے استوار کر دیا ہے۔ اور اب ان پر وہ توہمات، تعصبات اور رسوم و رواج قانون کی صورت میں نافذ نہیں کیے جا سکتے جو جاہلی قبائلی معاشروں کی خصوصیت تھے اور جن میں، "تبدیلی و تغیر" کو قبول کر لینا، فطرت اور قرآن کے قانون کے عین مطابق ہے۔

پاکستان کے مذہبی علماء کو برتری کا یہ احساس ہے کہ اسلامی احکام کی تعبیر و تشریح کا حق صرف ان کے لیے مخصوص ہے۔ جبکہ ہمارے کانوں تک، ملک سے باہر مقیم بعض تعلیم یافتہ خواتین کے اس قسم کے ارادوں کی خبریں بھی پہنچتی رہتی ہیں کہ وہ قرآن و سنت کی تعبیر کے سو فیصد "مردانہ حق" کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے قرآن و سنت کا خود مطالعہ شروع کر دیا ہے اور انہیں اس سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ان کو پختہ یقین ہے اسلامی فقہ و تاریخ کے محققانہ تجزیے کے بعد، وہ ثابت کر دیں گی کہ مردوں نے، دینی احکام کو ہمیشہ اپنے "حاکمانہ" مفادات میں استعمال کیا ہے۔ اس کی ایک مثال تو حال ہی میں سامنے آچکی ہے، مشرق وسطیٰ کے ایک شاہ پرست معاشرے کی ایک یونیورسٹی کے مذہبی اسکالر نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ شب عروسی کو، اگر خاوند کو شک پڑ جائے کہ اس کے نکاح میں آنے والی عورت کا کردار مشکوک ہے تو اسے منکوحہ کو فوراً طلاق دے دینی چاہیے۔ دنیائے اسلام کے کسی عالم دین نے، اس مفتی سے یہ نہیں پوچھا کہ اگر عورت کو خاوند کے کردار پر شک پڑ جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ یعنی عصمت کا تصور صرف عورت کے ساتھ وابستہ ہے اور مرد ہمیشہ "نہلایا دھلایا گھوڑا" رہتا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن و سنت کا مطالعہ کرنے اس میں اجتہاد کرنے کی قائل خواتین وہ ہیں جو قرآن و سنت سے باغی

پاکستان کے تعلیمی میدان میں عورت، مرد کو پچھاڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے

ہوتے کا ارادہ نہیں رکھتیں وہ دین اسلام کی سرچ لائٹ کی اعانت سے، آگے بڑھنے کے راستے تلاش کرنے کی خواہشمند ہیں۔ اور اگر ہمارے علماء نے، اپنے رویے میں کوئی مثبت تبدیلی پیدا نہ کی تو وہ وقت بہت قریب آنے والا ہے جب تعلیم یافتہ خواتین دنیوی اور دینی علوم میں تخصیص حاصل کرنے کے بعد، مسائل زندگی کے حل وکشود کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں گی اور تب اجتہاد کو بھی (FEMINISM) کی تحریک سے محفوظ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم ایسی خواتین کو بھی جانتے ہیں جو عورتوں کے معاملے میں، اسلامی تعلیمات سے یا تو بے خبر ہیں یا قطعی طور پر مایوس ہیں اور وہ ان لوگوں کی بات سننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں جو حقوق نسواں کی جنگ میں، خدا اور خدا کے رسول سے ہمت حوصلہ اور ہدایت طلب کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خواتین کو ان کے انسانی حقوق صرف سیکولر معاشرہ ہی فراہم کر سکتا ہے اور مذہب سے انہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ انہیں یہ شکوہ بھی ہے کہ جب کبھی علماء کو آواز دی گئی، انھوں نے خواتین کو بری طرح مایوس کیا ہے۔ وہ اپنے خطبوں اور تحریروں میں اجتہاد کی بات ضرور کرتے ہیں، خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے اظہار ہمدردی بھی کر لیتے ہیں لیکن جب اجتہاد کا وقت آتا ہے یہ سب، اپنے اپنے کاروباری اور طبقاتی مفادات کی حفاظت کے پیش نظر، محض ماضی پرستی، تقلید پسندی اور تھیا کریسی کے تاریک خیال نمائندے بن کر سامنے آتے ہیں۔ ہمیں تو ایسے مفتیان کرام کا بھی تجربہ ہے جن کی ہم زندگی بھر اس لیے عزت کرتے رہے کہ ان کا علم و فکر اور کردار مفاد پرستیوں کے اندھیروں میں روشنی کا مینار ہے۔ وہ بیدار مغزی کے بڑے بڑے دعوے بھی کرتے رہے لیکن جب عمل کا وقت آیا تو زبان پر کلمہ حق لانے کی بجائے پہلے کسی دارالعلوم سے وابستہ اپنی روزی یا وقت کے حاکم کی پیشانی پر ابھرتے والی شکنوں کو گننے کی کوشش کی اور بالآخر، نہ صرف خود بھاگ گئے بلکہ رجعت پسندی کا "کاروبار" کرنے والے حلقوں کی طرف سے، ہم جیسے لکھنے والوں کی تحریر و تقریر پر پابندی عائد کرانے کی تحریک کی پرزور حمایت بھی کر دی۔

مقالے کے شروع میں، مغربی معاشروں میں پروان چڑھنے والی عورتوں کی آزادی کی تحریکوں کا ذکر، خصوصی طور پر یہ سمجھانے کے لیے کیا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے سائنسی دور میں، ان عورتوں کے خیالات سے، تیسری دنیا بلکہ اسلامی دنیا کی عورتیں بھی متاثر ہو سکتی ہیں اور اگر ہم نے پاکستان کی خواتین میں پیدا ہونے والے شعور سے ابلاغ اور افہام و تفہیم کا رشتہ استوار نہ کیا تو ہو سکتا ہے ردعمل کے طور پر پڑھی لکھی عورتوں میں وہ نعرے مقبولیت حاصل کرنے لگیں جو مغرب میں عورتوں کی زبان پر ہیں۔ اس بحث میں، ایک نہایت اہم نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ عورتوں کے مسائل اور مصائب کا حل تلاش کرنے کی بات کرنا، مغرب پرستی یا اباحیت پسندی سے قطعاً مختلف چیز ہے اور اسی لیے اقتصادی لحاظ سے خود کفیل مغربی عورت اور تیسری دنیا کے مفلس معاشروں کی مظلوم اور غیر ترقی یافتہ عورت کی جدوجہد میں، سو فیصد مماثلت تلاش کرنا ایک نامناسب سی بات ہے۔ مغربی عورتوں کی بعض تحریکوں کے نعروں کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا، تعیشات زندگی کی افراط نے انھیں نفسیاتی اور معاشرتی الجھنوں کا شکار بنا دیا ہے اور انھوں نے اپنے نیوراسس کو غیر متعین "حقوق" اور "آزادی" کا لبادہ اڑھانے کی کوشش کی ہے جبکہ تیسری دنیا کی عورت، کئی معاشروں میں ابھی تک بھیڑ بکریوں جیسی زندگی بسر کر رہی ہے۔ (اور ایسے معاشروں میں اب پاکستان کا خاص طور پر شمار ہونے لگا ہے)

مغرب کے اکثر لکھنے والے، اپنے طور پر یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ پاکستان کی خواتین اپنے خلاف نامنصفانہ قوانین میں ایسی جکڑی گئی ہیں کہ انھوں نے، تن بہ تقدیر، حالات کے سامنے ہتھیار پھینک دیے ہیں لیکن ان میں سے جس اسکالر یا صحافی کو، حسن اتفاق سے پاکستان کا دورہ کرنے کا موقع ملا ہے تو وہ پاکستان کی پڑھی لکھی خواتین کے اعتماد اور حوصلے کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا ہے۔ ایک مخصوص گروہ کے پروپیگنڈے کے برعکس ان عورتوں نے اپنی گھریلو زندگی کو، گھر سے باہر کی مصروفیات کے باوجود، پراگندگی اور انتشار کا شکار نہیں ہونے دیا۔ پاکستان کی ۹۵ فیصد عورت محنت کش ہے اور گھر کی معیشت اور معاشرت چلاتے ہیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا کردار مرد کے برابر بلکہ بعض صورتوں میں مردوں سے زیادہ ہے۔ پاکستان کی تعلیم یافتہ عورتوں کی اکثریت ایسی ہے جو گھریلو ذمہ داریوں اور دفتری یا پیشہ ورانہ اور سماجی مصروفیات میں توازن و اعتدال برتنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں ... اور مغربی عورت کی ناکامیوں سے انھیں یہ سبق حاصل ہوا ہے کہ اگر انھوں نے گھروں کو، گھرانوں کو اور منظم معاشرے کے استحکام کو خطرے میں ڈال دیا ... جس پر خود ان کی اپنی حفاظت کا بھی انحصار ہے۔ اور اپنی اس حیثیت کو فراموش کر دیا جو اعلیٰ اخلاقی قدروں کی نگراں ہونے کے اعتبار سے، ان کا اصلی اور حقیقی منصب و مقام ہے ... تو اس سے اور کسی کو اتنا نقصان نہیں پہنچے گا، جتنا خود عورتوں کو پہنچے گا۔ جو گھر بکھر گیا، اس گھر کی بیوی نیوراتی، شوہر ظالم اور بدمزاج اولاد بدخو اور بدتمیز بن جاتی ہے۔ پاکستان میں عورتوں کے بارے میں "مغرب زدگی" کی اصطلاح، بہت گمراہ کن ہے اور اکثر اوقات، اسے درست پس منظر میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ جس عورت کی پہچان، صرف عریانیت، نمود و نمائش اور جنسی انتشار ہے، وہ بھی دراصل ایک مخصوص طبقہ امراء کے مردوں کی جسم پرستی کے پیدا کردہ ماحول کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس طرز زندگی کا، فی نفسہ، عورت کی تعلیم یا اس کے سماجی شعور کی ترقی پسندی سے ہرگز ہرگز کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپ تحقیق کر کے دیکھ لیں، ایسی عورتوں کا علمی اور ذہنی معیار، معاشرے کی ذمہ دار کارکن اور پڑھی لکھی عورتوں کے مقابلے میں بہت پست ہوتا ہے۔

چنانچہ دیکھنے اور سننے میں یہی آیا ہے کہ غیر ملکی صحافی یا ادیب پاکستانی عورت کا جو تصور، اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے، وہ تصور جلد ہی ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کے اس نارمل معاشرے میں نفسیاتی مزاحمتوں کے باوجود مسلمان عورت ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے اور اسے شدت کے ساتھ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اسلام کے نام پر نافذ ہونے والے نئے (یعنی پرانے) قوانین پاکستانی عورت کی معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی زندگی میں پائے جانے والے جوش و خروش کو کم نہیں کر سکے اور شاید، مستقبل میں بھی نہیں کر سکیں گے ان میں سے بعض قوانین کتابوں کا حصہ ضرور بن گئے ہیں لیکن ان پر عمل درآمد، کارے دار ہوگا۔ چنانچہ سرقہ، قذف، قتل اور زنا وغیرہ کے مقدمات میں دی گئی سزاؤں کا ایک طائرانہ جائزہ ثابت کر دے گا کہ کتابوں میں لکھے گئے "اسلامی" قوانین کے تحت، کتنی عبرت ناک سزائیں دی گئی ہیں؟ قصاص و دیت کے سلسلے میں، ابھی تک کوئی متفقہ نقطہ نظر نہیں آ سکا؟ حدود کے مقدمات میں، عورت کی گواہی کو، اگرچہ تسلیم نہیں کیا گیا لیکن اس استثنا کی بدولت، عدالتوں کو جلد ہی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بلکہ ہمارے سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ بعض جرأت مند خواتین نے حدود قوانین کو چیلنج کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ موجودہ حکومت کا اسلام، کسی ایسی مظلوم عورت کو تحفظ دینے سے قاصر رہتا ہے جو بدقسمتی سے تنہائی میں جنسی تشدد کا شکار بن جاتی ہے اور صرف اپنے عورت ہونے کے ناتے، اپنی عزت کے دشمن کے خلاف گواہی نہیں دے سکتی۔ دوسری طرف، مالی معاملات یا مستقبل کی ذمہ داریوں سے متعلق دستاویزات پر، نئے اسلامی قانون شہادت کی رو سے، صرف ایک عورت کے تصدیقی دستخط قبول نہیں ہونے چاہئیں، لیکن عملاً، سرکاری دفتروں، کمپنیوں اور بینکوں میں، خاتون افسران، روزانہ ہزاروں کی تعداد میں دستاویزات پر دستخط کر رہی ہیں اور خدا ہی جانتا ہے کہ عدالت میں وہ منظر کیسا لگے گا۔ جب گواہی کے لیے پیش ہونے والی دو عورتوں میں سے صرف ایک ہی عورت گواہی دے رہی ہوگی اور دوسری پاس خاموش کھڑی رہے گی تا آنکہ اسے اچانک یاد دہانی کی ضرورت محسوس ہو جائے۔ لیکن اس وقت کیا ہوگا جب ایک عورت دباؤ یا ترغیب میں آکر یا سچ سچ، عین موقع پر دوسری عورت کی گواہی کی تفصیلات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گی۔ یا تب کیا صورت ہوگی جب گواہی کے لیے ایک مرد بھی میسر نہ ہو سکے گا۔ کیا ایسے میں قانون شہادت نے چار عورتوں کی گواہی کی گنجائش رکھی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ نئے قانون شہادت کے آرٹیکل، اے کے (اے ۲) کو طالب علم صرف لا کی کتابوں میں پڑھا کریں گے، اس پر عمل درآمد معطل ہی رہے گا۔ فی الحال تو قصاص و دیت پر بحث بھی تعطل کا شکار ہے اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر پارلیمنٹ نے دباؤ میں آکر مرد کے مقابلے میں عورت کی آدھی دیت قبول کر لی تو پھر تعدد ازدواج کے دروازے کھولنے کے لیے نئی ترمیم منظور کرانے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔ جب گواہی میں عورت آدھی رہ گئی تو ایک خاوند کے لیے ایک بیوی کا فلسفہ کیونکر قابل قبول رہ جائے گا؟ وہاں بھی تو ایک بیوی کی حیثیت نصف ہی گی اور دو عورتیں مل کر ہی ایک مکمل بیوی کے برابر حقوق حاصل کر سکیں گی بعض مذہبی حلقے، اس نکتہ رسی پر خوش بھی ہو سکتے ہیں کہ دیکھو! شریعت کے قوانین میں کس طرح؟ منطقی ربط پایا جاتا ہے اور... بالآخر اگر یہی منطقی ربط عورت ووٹ کے سلسلے میں بھی تلاش کر لیا گیا تو شاید، اسے بیسویں صدی کا سب سے بڑا اجتہاد تسلیم کر لیا جائے اور تب اقوام عالم میں پاکستانی قوم اور اسلام کا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔

مردوں نے دینی احکام کو ہمیشہ اپنے حاکمانہ مفادات میں استعمال کیا ہے

ریاستی تشدد اور ایذارسانی

ندیم اختر

تہذیب کے ارتقائی تناظر میں دیکھا جائے تو ۲۰ویں صدی آج تک کی سب سے زیادہ مہذب، روشن خیال اور ترقی یافتہ صدی کہی جاسکتی ہے۔ اس صدی کے دوران انسانی دانش اور شعور نے حیرت انگیز معجزے رونما کیے لیکن اس کرشماتی صدی نے ریاستی تشدد اور ایذارسانی کا ایک ایسا تاریک باب بھی رقم کیا ہے جس کی مثال تاریخ کے بدترین عہد میں بھی نہیں ملتی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران صرف ایک فاشسٹ ریاست نے تشدد، قتل اور ایذارسانی کا وہ بازار گرم کیا جسے انسانیت رہتی دنیا تک فراموش نہیں کرسکے گی۔

ریاست، کسی ملک میں قائم سماج پر قابض طبقات کی قوت کا سرچشمہ ہوتی ہے اور حکومت ریاست کی اس مشین کی مانند ہے جسے حاوی طبقات اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ریاستی مشینری کے تشدد اور ایذارسانی کا نشانہ زیادہ تر ایسے لوگ بنتے ہیں جو کسی اخلاقی یا سماجی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ یہ معاشرے کے وہ باشعور اور حساس افراد ہوتے ہیں جو اپنے اُس حق کو استعمال کرنے کے "جرم" کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جسے انسان نے ہزارہا برسوں کی جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے۔ چند سو سال پہلے فرانسیسی دانشور والٹیر کو جب، حکومت مخالف نظریات رکھنے کے جرم میں جلاوطنی کا حکم دیا گیا تو اس کے سب سے بڑے نظریاتی مخالف اور عظیم فلسفی روسو نے اُسے ایک خط تحریر کیا تھا جس میں اس نے کہا تھا "ہر چند کہ جو کچھ تم سوچتے ہو میں اُسے کلی طور پر مسترد کرتا ہوں لیکن میں تمہارے اس حق کے لیے آخری دم تک لڑوں گا کہ جو کچھ سوچتے ہو اس کے کہنے کا حق تمہیں حاصل ہے"۔

آج اختلاف رائے کے حق کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جاچکا ہے لیکن اہم اور غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا انسان کو اپنے اس جائز حق کو استعمال کرنے کی آزادی حاصل ہے؟ دنیا کی زیادہ تر حکومتیں اختلاف رائے کو دبانے کے لیے جس بڑے پیمانے پر تشدد اور ایذارسانی کا استعمال کررہی ہیں اس کے جائزے کے بعد یہ المناک حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اختلاف رائے کا حق بعض ریاستوں کے دساتیر اور بین الاقوامی عہدناموں کا ایک حصہ ضرور ہے لیکن عملاً اسے استعمال کرنے کی آزادی کم ہی ملکوں کے شہریوں کو حاصل ہے۔

مذکورہ بالا صورتحال کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی رکن حکومتیں ایک طویل عرصے تک تشدد اور ایذارسانی کی تعریف اور تشریح پر متفق نہ ہوسکیں، اس امر پر اتفاق رائے نہ ہونے کے بعض اسباب تھے۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں جو نو آزاد ملک وجود میں آئے، ان کی اکثریت پر غیر جمہوری اور آمرانہ حکومتیں برسر اقتدار آگئیں جن کی پشت پناہی جدید نوآبادیاتی طاقتیں کررہی تھیں۔ چونکہ ریاستی جبر اور تشدد کسی بھی غیر جمہوری نظام کے قیام کے لیے ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے جبر و تشدد جیسے اہم انسانی اور اخلاقی مسئلے کو نظر انداز کرنے کا رویہ اختیار کیا جاتا رہا۔ بہرحال عالمی رائے عامہ کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور بعض ضروریات کے پیش نظر اقوام متحدہ کی رکن حکومتوں نے پرتشدد، اذیتناک اور غیر انسانی سزاؤں کے خلاف مندرجہ ذیل اعلان نامے اور قراردادیں منظور کرلیں۔

۱- ۱۹۴۸ء میں انسانی حقوق کا عالمی منشور منظور کیا گیا جس کے آرٹیکل ۵ میں کہا گیا ہے "کسی انسان کو پرتشدد، ظالمانہ، غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا"۔

۲- ۱۹۴۹ء کے جینوا کنونشن کے آرٹیکل ۳ کے ذریعے انسانی وقار کے خلاف بالخصوص ذلت آمیز سزاؤں پر پابندی عائد کردی گئی۔

۳- ۱۹۶۶ء کے بین الاقوامی ضابطہ برائے شہری اور سیاسی حقوق، کے آرٹیکل ۷ میں کہا گیا "کسی کو اذیتناک، اہانت آمیز یا غیر انسانی سلوک اور سزا کا ہدف نہیں بنایا جائے گا"۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۶ء تک منظور کیے جانے والے اعلانات اور قراردادوں کا دائرہ صرف سلوک اور سزا تک محدود رہا اور تشدد کی جامع تعریف اور تشریح جیسا اہم اور بنیادی مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ بین الاقوامی طور پر کسی متفقہ تعریف کی عدم موجودگی کے بڑے سنگین نتائج برآمد ہوئے۔ ہر حکومت نے تشدد اور ایذارسانی کی خود ساختہ تشریح کی آڑ میں اپنی مخالف سیاسی قوتوں کو کچلنے کے لیے جبر و تشدد کا سلسلہ تیز کردیا۔ انسانی حقوق کی بڑھتی ہوئی خلاف ورزیوں اور روز افزوں تشدد کو روکنے کی غرض سے کئی مزاحمتی گروپ اور تنظیمیں قائم ہوگئیں۔ ان تنظیموں کی بھرپور جدوجہد کے نتیجے میں ایک عرضداشت تیار کی گئی جس پر مختلف اقوام کے دس لاکھ سے زیادہ لوگوں نے اپنے دستخط ثبت کیے اور اس عرضداشت نے ۱۹۷۵ء میں اقوام متحدہ کے "تشدد کے خلاف اعلان نامہ" کی تیاری اور فوری منظوری کی راہ ہموار کی۔

۹ دسمبر ۱۹۷۵ء کو منظور کیے جانے والے اس اعلان نامے میں پہلی مرتبہ ریاستی تشدد اور ایذارسانی کی ایک ایسی جامع تعریف اور تشریح وضع کرنے کی کوشش کی گئی جو تمام رکن حکومتوں کو قابل قبول ہو۔ اس دستاویز میں ایسے تمام اقدامات کی وضاحت بھی کردی گئی ہے جو تشدد یا ایذارسانی کے زمرے میں آسکتے ہیں۔ اس اعلان نامہ میں مذکورہ اصطلاح کی تشریح کچھ یوں بیان کی گئی ہے

۱- اس اعلان نامے کے مقاصد کے مطابق ایذارسانی، کسی سرکاری اہلکار یا اس کے ایماء پر کیا جانے والا وہ شدید جسمانی یا ذہنی، تکلیف یا اذیت پہنچانے والا ارادی عمل مراد ہے جو کسی شخص سے خود اس کے اپنے یا کسی تیسرے فرد سے متعلق معلومات

ایذارسانی سے مراد انتہائی اور ارادی قسم کی ظالمانہ، غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک یا سزا ہے۔

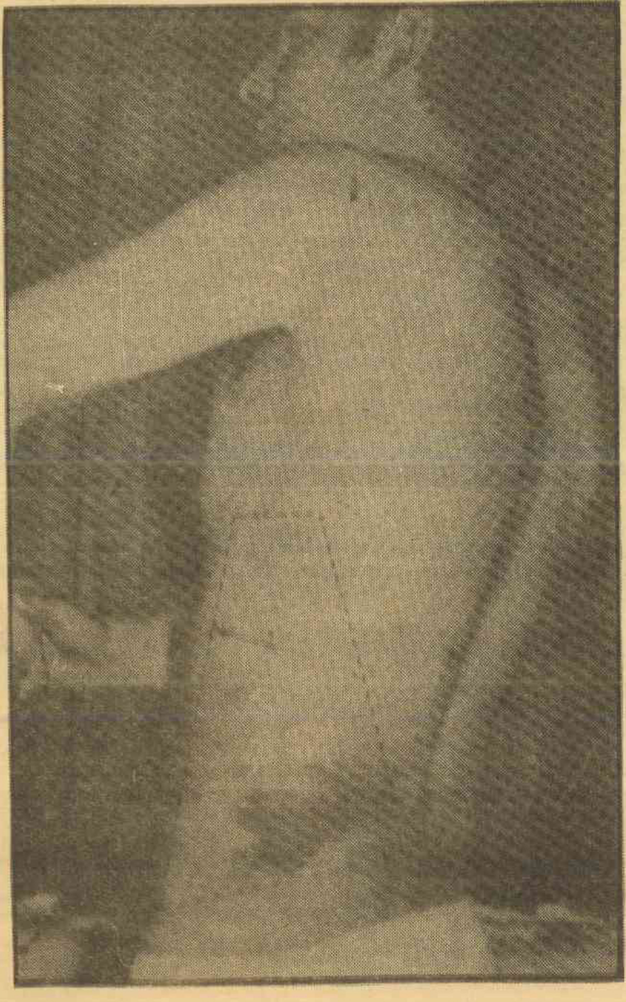

حاصل کرنے یا اقرار جرم کرانے یا اس فعل کی سزا دینے کے لیے کہ جس کا اقرار کیا جا چکا ہے یا کسی فرد یا افراد کو خوفزدہ کرنے کی غرض سے کیا جائے۔

اس میں صرف کسی ایسے قانون کے نتیجے میں پیدا ہونے والی فطری یا اتفاقی تکلیف یا اذیت شامل نہیں جو "قیدیوں سے برتاؤ کے ضوابط کے کم سے کم معیار" سے مطابقت رکھتا ہو۔

۲۔ ایذارسانی سے مراد انتہائی اور ارادی قسم کی ظالمانہ، غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک یا سزا ہے۔

یہ اعلان نامہ آزادیٔ فکر کی علمبردار طاقتوں کے لیے ایک بڑی کامیابی کی نوید ثابت ہوا۔ اس سے اقوام متحدہ کے وقار میں بھی گرانقدر اضافہ ہوا کہ جس نے بالآخر اپنی اُن رکن حکومتوں سے اس اعلان نامہ پر تائید حاصل کر لی جس کی اکثریت خود اس اعلان نامہ میں درج مقاصد کے منافی عمل کرنے کا ریکارڈ رکھتی تھی۔ اقوام متحدہ کے فیصلوں کا اطلاق چونکہ رضاکارانہ ہوتا ہے اس لیے ریاستی تشدد اور ایذارسانی کے واقعات میں کسی بڑی کمی کے امکانات زیادہ روشن نہیں تھے لیکن یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ اس اعلان نامے کے کوئی بہتر نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ کم از کم دو پہلو ایسے ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اول یہ کہ اس اعلان نامے کی خلاف ورزی کرنے والی حکومتوں نے نسبتاً کچھ محتاط رویہ اختیار

کیا اور دوم یہ کہ ریاستی تشدد اور ایذارسانی کی نشاندہی کا متفقہ طور پر ایک بین الاقوامی پیمانہ وجود میں آگیا جس سے جمہوری حقوق کی خاطر جدوجہد کرنے والی قوتوں کو بڑی تقویت ملی۔

مذکورہ بالا دونوں پہلو نسبتاً موضوعی نوعیت کی افادیت کے حامل ہیں، تشدد اور ایذارسانی کے خلاف غیر سرکاری سطح پر ہونے والی ان کارروائیوں سے عالمی رائے عامہ کو مجتمع کرنے میں مدد یقیناً ملی ہے لیکن عملی طور پر تشدد کے واقعات میں کسی بڑی کمی کا رجحان دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس صورتحال سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ریاستی جبر اور تشدد کے پیچھے جو مقاصد کارفرما ہیں وہ اپنی نہاد میں اتنے مضبوط ہیں کہ انہیں محض غیر اخلاقی یا شرفِ انسانی کے منافی قرار دے کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر ملکوں کی آمرانہ حکومتوں کے خلاف جدوجہد کرنے کی جمہوری راہیں مسدود ہو چکی ہیں جس کے باعث عوامی مزاحمت نے جنگ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس مزاحمت کو کچلنے کے لیے یہ حکومتیں "قومی سلامتی" کے مقدس نعرے کی آڑ میں تشدد کا استعمال کرتی ہیں، خصوصاً ایسے علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے اور آبادی کو حکومت مخالف افراد کی مدد سے باز رکھنے کے لیے تشدد کی کارروائیوں کی باقاعدہ نمائش کی جاتی ہے۔

ایشیا و افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں ریاستی تشدد اپنی انتہائی شکل میں موجود ہے۔ تشدد ایک "فن" کی صورت اختیار کر چکا ہے اور ایذارسانی کے مختلف طریقے ایجاد ہو چکے ہیں جن میں قید تنہائی یا خفیہ حراست میں رکھنے، دوران حراست عزیزوں اور قانونی مشیروں سے نہ ملنے دینے اور دوران تفتیش آنکھوں پر پٹی باندھ کر تشدد کرنے جیسے طریقے شامل ہیں۔ وسطی ایشیا کے ایک ملک سے تعلق رکھنے والے ایک سیاسی قیدی کا تجربہ مذکورہ نوعیت کی ایذارسانی کی مثال پیش کرتا ہے۔ وہ اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "بدترین بات یہ تھی کہ اُس ... جیل کے قیدیوں کی آنکھوں پر مسلسل پٹی بندھی رہتی تھی اور وہ اُس دن کے انتظار میں شب و روز گزارتے تھے کہ جب کوئی آئے گا اور انہیں بتائے گا کہ وہ یہاں کس جرم میں قید ہیں۔ کچھ لوگ دنوں، ہفتوں یا مہینوں تک اسی حالت میں پڑے رہتے تھے۔ ایک شخص نے ستائیس ۲۷ مہینے اسی حالت میں گزارے۔ ستائیس مہینوں بعد جب اُس کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھولی تو اُس کے لبوں پر چپ کی مہر لگ چکی تھی۔

وہ خاموشی سے بیٹھا اپنے سر کو اِدھر اُدھر ہلاتا رہتا اور کبھی کبھی دیوار پر سر سے ضربیں لگانے لگتا۔ آنکھوں پر پٹی باندھنے کا مقصد لوگوں کے خوف میں اضافہ کرنا تھا۔ وہ جب اچانک پٹی کھول کر سوالات کی بوچھاڑ کرتے تو روشنی اذیت بن جاتی، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا اور غنودگی طاری ہو جاتی تھی، کسی ایک بات یا خیال پر ذہن کو مرتکز رکھنا ناممکن تھا۔

ایذارسانی کے عمل کے دوران زیر تشدد فرد کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ زندگی اور موت تشدد کرنے والوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مغربی ایشیا کے ایک ملک کے زیر حراست ٹریڈ یونین رہنما سے تشدد کرنے والی جماعت کے سربراہ نے کہا "تم بولو یا خاموش رہو، موت ہر حال میں تمہارا مقدر ہے۔ ہم تمہاری موت کا سبب خودکشی یا مقابلہ قرار دیں گے۔ اب تمہارے زندہ بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

تشدد اور ایذارسانی کے ذریعے انتہائی ذہنی دباؤ اور جسمانی تکلیف پہنچا کر، غلط یا درست اقرار ناموں پر دستخط کرائے جاتے ہیں اور معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ لاطینی امریکہ کا ایک سیاسی قیدی اپنے ملک کی خفیہ پولیس کے تشدد کی کہانی اس طرح بیان کرتا ہے: "جب سب کچھ ہو چکا تو ایک ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔ اگلے روز تفتیش کا عمل پھر شروع ہو گیا۔ میرے چہرے اور جسم پر شدید ضربیں لگائی گئیں اور ہاتھوں پر بجلی کے جھٹکے دیے گئے... اکیس دنوں تک مجھے ایک خفیہ مقام پر رکھا گیا۔ گرفتاری کے پہلے ۱۴ دنوں تک مجھے بلاناغہ جسمانی اور نفسیاتی ایذائیں دی گئیں۔ ایذارسانی کے ہر دورانیہ کے بعد ایک ڈاکٹر میرا معائنہ کرتا تھا۔ مجھے ایک ایسی دستاویز پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ میرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا ہے۔ اس دستاویز میں وہ بیانات بھی درج تھے جو میں نے انتہائی دباؤ اور تکلیف کے عالم میں دیے تھے اور ایسی باتیں بھی تحریر کی گئی تھیں جو میں نے بالکل نہیں کہی تھیں جب میں نے دستخط کرنے سے انکار کیا تو مجھے مزید تشدد کی دھمکیاں دی گئیں۔ صورتحال ایسی تھی کہ مجھے مجبوراً دستخط کرنے پڑے۔"

ریاستی تشدد کا دائرہ چونکہ بہت وسیع ہوتا ہے اس لیے بسا اوقات ایسے لوگ بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں جن سے حقیقتاً کوئی "سیاسی جرم" سرزد نہیں ہوتا۔ ایک افریقی جیل سے دس سال بعد رہا ہونے والے ایک قیدی نے بتایا کہ اُسے اپنے ملک کے صدر کی شان میں "گستاخی" کرنے کے الزام میں دس سال تک قید میں رکھا گیا۔ قید کے دوران اُس پر تقریباً روزانہ تشدد کیا جاتا تھا۔

جسمانی ایذارسانی کے علاوہ نفسیاتی طور پر بھی ایذائیں دینے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ سیاسی نظربندوں کو نفسیاتی اسپتالوں میں داخل کر کے ایسی ادویات استعمال کرائی جاتی ہیں جس سے ان کا اعصابی اور ذہنی نظام متاثر ہو جاتا ہے اور فکری مزاحمت کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔ یورپ کے ایک مشہور اور انتہائی ترقی یافتہ ملک میں ایذارسانی کے متعدد واقعات سامنے آئے ہیں۔ ایک پینتیس سالہ شخص جبری طور پر استعمال کرائے جانے والی دواؤں کے اثرات یوں بیان کرتا ہے: "مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا اور میری

تشدد کے طویل المدت اثرات غنودگی، افسردگی، خوف، بے خوابی، اعصابی کمزوری اور خودکشی کے رجحان کی شکل میں سامنے آتے ہیں

ریاستی تشدد اور ایذارسانی کا شکار زیادہ تر وہ لوگ بنتے ہیں جو کسی اخلاقی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے

ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ مجھ میں چلنے کی سکت نہ رہی، ذرا سی حرکت پر کولہوں میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ یہ سلفازن کا اثر تھا۔ مجھ پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ میں فرش اور دیواروں سے سر ٹکرانے لگا۔ درد کے باعث نہ کھانا ممکن تھا اور نہ سونا۔ سلفازن کی وجہ سے میرے جسم کا درجہ حرارت بڑھ کر چالیس ڈگری سنٹی گریڈ تک پہنچ گیا۔ مجھے ہلکی ہلکی سردی محسوس ہوتی تھی اور میری زبان باہر

نکل آتی تھی۔ یہ عذاب ایک ہفتے تک جاری رہا...!"

تشدد اور ایذارسانی کے ذریعے چونکہ سیاسی اور طبقاتی مخالفین کو خوفزدہ، غیر فعال، کمزور اور بے بس بنانا مقصود ہوتا ہے اس لیے ایذارسانی کی کارروائیاں صرف جسمانی اور نفسیاتی معاملات تک محدود نہیں رہتیں۔ مذکورہ مقاصد کے حصول کے لیے دیگر کئی اور حربے بھی استعمال کیے جاتے ہیں جن میں سیاسی اسیروں کی تذلیل اور بے عزتی کرنا، ان کی عزت نفس کو مجروح کرنے کے لیے دوسرے طریقے استعمال کرنا اور ان کے سامنے ان کے اہل خانہ کے ساتھ زیادتی ایسے حربے شامل ہیں۔ سیاسی قیدیوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس نوعیت کی ایذارسانی کا شکار ہوتی ہے۔

ریاستی تشدد اور ایذارسانی کے باعث مرنے والوں کی تعداد میں اضافے کا رجحان واضح طور پر نظر آتا ہے۔ تشدد کی تاب نہ لاکر ہلاک ہونے والا شخص اگر غیر معروف ہو اور اس کی گرفتاری کا علم آزاد ذرائع ابلاغ، سیاسی حلقوں اور انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کو نہ ہو تو پھر وہ شخص صفحۂ ہستی سے کسی حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ اگر صورتحال اس کے برعکس ہو تو مرنے والے کی موت کا سبب، خودکشی، پولیس سے مقابلہ، بیماری یا دل کا اچانک دورہ قرار دیا جاتا ہے۔ سرکاری طور پر ہونے والے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ حکومت کے اس دعوے کی تصدیق فراہم کرتی ہے اور مرنے والے کے متعلقین انتقامی کارروائی کے خوف سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ زیادہ تر سیاسی قیدی زندہ بچ جاتے ہیں اور آزاد کر دیے جاتے ہیں لیکن ان کی اکثریت ایذارسانی کے باعث پیدا ہونے والے مسائل کا شکار رہتی ہے۔ یہی وہ اہم پہلو ہے جسے عام طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

انسانی جسم پر انتہائی درجے کے تشدد کے فوری اور دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فوری ردعمل جسم کے مختلف حصوں میں درد، بھوک کے ختم ہو جانے، وزن گرنے کی شکل میں سامنے آتا ہے جبکہ طویل المدت اثرات میں قوت ارتقاز میں کمی، غنودگی، ڈیپریشن، خوف، بے خوابی، اعصابی کمزوری اور تناؤ، خودکشی کا رجحان اور دیگر نوعیت کی جسمانی اور نفسیاتی بیماریاں شامل ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کو رہائی کے بعد سماجی، طبی اور نفسیاتی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایذارسانی سے متاثرہ افراد کی اکثریت تیسری دنیا کے غیر جمہوری ملکوں سے تعلق رکھتی ہے اور اپنی اپنی حکومتوں کے یہ معتوب لوگ کسی بھی قسم کی مدد سے یکسر محروم رہتے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت لازم ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں تشدد اور ایذارسانی کو آئینی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک سیاسی یا غیر سیاسی مقاصد کے لیے کسی بھی شخص کو اذیت نہ دینے کے پابند ہیں۔ ان دونوں باتوں کے باوجود دنیا کی بیشتر حکومتیں جس طرح ان بین الاقوامی عہدناموں کی خلاف ورزیوں کی مرتکب ہو رہی ہیں

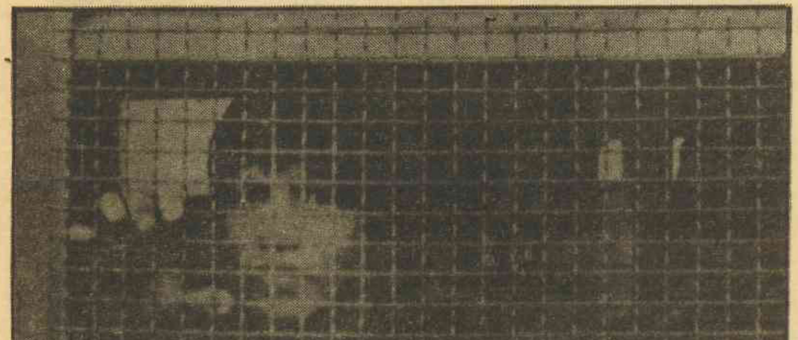

اور خود اپنے ممالک کے آئین سے روگردانی کر رہی ہیں اس نے انسانی بنیادوں پر ایک ایسی سنگین صورتحال کو جنم دیا ہے جس کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ آزاد ذرائع ابلاغ، وکلاء، ادیب، دانشور اور حقوق انسانی کے لیے سرگرم انجمنیں اور کارکن اپنی سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر تشدد اور ایذارسانی کے واقعات پر کڑی نظر رکھیں اور رائے عامہ کو اس کے خلاف منظم کریں۔ صرف رائے عامہ کا مؤثر دباؤ ہی تشدد اور ایذارسانی کے واقعات اور شدت کی کمی میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے۔

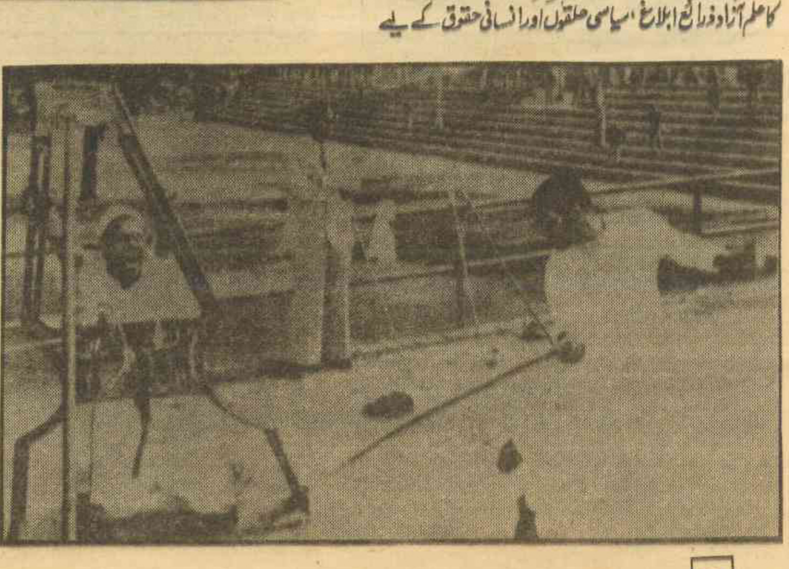

اطہر عباس

ذہنی مہارت کا انخلاء

کسی بھی ملک کا تعلیمی ڈھانچہ ملکی ترقی کے نظام کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور اس نظام کے رجحانات اور طریقۂ کار کی عکاسی کرتا ہے جو پورے ملک کی سماجی اور معاشی ترقی کے لیے زیرِ استعمال ہو۔

پاکستان کے معرضِ وجود آنے کے بعد جس لائحۂ عمل کا انتخاب کیا گیا اور جو طریقۂ کار سماجی، صنعتی اور معاشی ترقی کے لیے چنا گیا وہ ترقی کا سرمایہ دارانہ طریقہ تھا۔ ۶۰ کی دہائی اس امر کا بخوبی اشارہ کرتی ہے کہ اس وقت کے حکمران طبقات یعنی ملٹری بیوروکریسی نے ہارورڈ یونیورسٹی ماہرین کی مدد سے جو معاشی پالیسی وضع کی اس نے پاکستان کو سرمایہ دارانہ طریقۂ ترقی اختیار کرنے میں مدد دی۔ اور ہارورڈ یونیورسٹی DEVELOPMENT ADVISORY SEVICE کی امداد کے زیرِ سایہ پاکستان نے امریکی نقطہ ہائے نگاہ کے ماتحت معاشی اور سماجی پالیسی تیار کی جو کہ اب بھی پاکستان کے حکمران طبقات کی عمومی سوچ ہے۔ پاکستان کا تعلیمی نظام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

ہمارا تعلیمی نظام نوآبادیاتی دور کی یادگار ہے۔ جسے ملکی تقاضوں کے تحت استوار کرنے کے بجائے غیر ملکی اور نوآبادیاتی ذہنیت کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ اور ملک کے حکمران طبقات شعوری طور پر اس نظام کو دوامی حیثیت دینے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ہمارا نظامِ تعلیم ملک کی سماجی معاشی اور معاشرتی ضروریات کو یکسر نظر انداز کر کے ایک مخصوص وضع کے طالب علم تیار کرنے کی سازش ہے۔ ایسا طالب علم جو عصری تقاضوں سے ناآشنا اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مالک ہو۔ طبقاتی جبر اور تقسیم، پاکستانی نظامِ تعلیم کا سب سے جابر پہلو ہے۔ جس میں ایک طرف تو کلرکوں کی فوج اور دوسری طرف نوکر شاہی اور اعلیٰ اداروں کے افسر تیار کیے جاتے ہیں۔

ہمارا نصابِ تعلیم ان نظریات کی تعلیم دیتا ہے جو کہ دنیا بھر میں اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اس نصاب میں پاکستانی معاشرے اور ماحول کی ضروریات اور تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر نہایت موضوعاتی انداز میں غیر ملکی نظریات اور غیر ملکی ماحول کے پس منظر میں پڑھائے جاتے ہیں۔ جو کہ ہمارا طالب علم رو رٹ کو پڑھ تو لیتا ہے لیکن اپنی کوئی معروضی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ آج ہارورڈ یا اسٹینن فورڈ کے پڑھے ہوئے طالب علم اور ماہرین..... اپنے اپنے میدان میں حرفِ آخر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کا پڑھا ہوا اعلیٰ سے اعلیٰ طالب علم ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نظامِ تعلیم کو چلانے والے غیر ملکی ماہرین کی مدد سے تعلیمی ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں اور اپنا معاشرتی پس منظر نظر انداز کر کے غیر ملکی طرزِ تعلیم نہایت بھونڈے پن سے ملک میں لاگو کرتے ہیں نتیجۃً جب ایک غیر ملکی اور غیر حقیقت پسند تعلیمی پالیسی نافذ ہوتی ہے تو کچھ تضادات جنم لیتے ہیں۔ یقیناً ترقی یافتہ ممالک کے تجربات سے مدد لینی چاہیے لیکن ان تجربات سے فائدہ اٹھانے کا واحد ذریعہ ان تجربوں کو اپنی ضروریات اور اپنے سماجی دائرے کو نظر میں رکھتے ہوئے استعمال کرنے کا ہے۔ ان تجربات اور نظریات کو یہاں استعمال کرتے وقت یہ نظر میں رکھنا چاہیے کہ وہ ایک مختلف سماج اور معاشرے سے نمود پذیر ہوئے ہیں۔

مثلاً معاشیات کو لیجیے۔ ہمارا معاشیات کا طالب علم ان نظریات اور معاشی ڈھانچہ کو جو کہ ترقی یافتہ ممالک میں موجود ہے پڑھ تو لیتا ہے لیکن اپنے معاشی اور سماجی ڈھانچہ سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے۔ معاشیات کے بنیادی اصول ہمارے معاشرے میں مختلف اور دوسرے ممالک میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے طالب علم کو ان اصولوں کی عمومی تعلیم تو دے دی جاتی ہے لیکن ملکی ضروریات اور معاشی نظام سے ناواقفیت کے تحت وہ اپنے مسائل سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بے روزگار ہونا بہت بڑی پریشانی ہے۔ جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں بے روزگاری الاؤنس ملتا ہے۔ میڈیکل تعلیم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ہاں سرجری اور دوسری اعلیٰ تعلیم تو دی جاتی ہے لیکن ملک میں پائی جانے والی عام بیماریوں کو تفصیل سے نہیں پڑھایا جاتا۔ غیر ملکی ماہرینِ طب کی کتابیں پڑھائی تو جاتی ہیں لیکن ان کتابوں کو جس سماج اور ماحول کے تحت لکھا گیا ہے وہ ہم سے قطعاً مختلف ہے۔ ٹائیفائڈ، ملیریا، ڈائریا وہ بیماریاں ہیں جو مغرب میں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں یہ عام بیماریاں ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں طب کی تعلیم میں جس پہلو کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے وہ ہمارے ہاں بالکل دوسرے انداز میں پایا جاتا ہے۔

جس ملک میں صحتِ عامہ اور صفائی ستھرائی کا نظام بالکل تباہ حال ہو، وہاں پر یہ شعبے ماہرینِ طب کی نظر میں اہم ہو جاتے ہیں۔ اور طب کی تعلیم میں علاج سے زیادہ احتیاطی تدابیر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں طب پڑھنے والوں کو علاج کے نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں احتیاطی نقطۂ نظر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ صحتِ عامہ کا مضمون پاکستان کے صحتِ عام کے نظام تحت ایک اہم ترین مضمون ہے۔ جس کو کہ ہمارے میڈیکل کالجوں میں ترجیحات کی بنیاد پر بالکل نیچے ڈال دیا گیا ہے۔ اور ہمارا طالب علم اس کو ایک بے کار چیز گردانتا ہے۔ وہ ادارے جو کہ ان ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لیے بنے ہیں جیسے میڈیکل اینڈ ڈینٹل کاؤنسل۔ ان میں بڑے ڈاکٹر اور پیسے والے لوگ بیٹھے ہیں جو کہ اپنی پریکٹس چلانے کے لیے کبھی نہیں چاہیں گے کہ ہمارے ہاں صحتِ عامہ کا نظام بہتر ہو اور بیماریاں جو کہ زیادہ تر اس ناقص نظام کا عطیہ ہیں ان میں کمی آئے۔

ایک اہم ترین اور بنیادی نقص جو کہ ہمارے تعلیمی نظام کا جزوِ لاینفک ہے اور حکمران اور اعلیٰ طبقات کی ایک شعوری کوشش ہے۔ وہ ہے "ذریعۂ تعلیم" ہمارا ذریعۂ تعلیم مغربی سوچ اور نوآبادیاتی فکر کا ایک اور نمونہ ہے۔ تمام اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ جبکہ ملک کی شرحِ خواندگی ۲۶٪ ہے جس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو کہ صرف اپنا نام لکھنا اور پڑھنا جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے اہم اور بنیادی پہلو یہ ہے کہ جس ملک میں مختلف قومیں اپنی الگ الگ زبانوں اور کلچر کے ساتھ رہتی ہیں۔ وہاں ایک غیر ملکی زبان اور صرف ایک ملکی زبان اردو میں تعلیم دی جاتی ہے۔ چاروں صوبوں کے اندرونی علاقوں میں وہاں کی علاقائی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ وہاں انگریزی اور اردو کو عوام پر تھوپنا ایک غیر حقیقت پسندانہ رویے کا اظہار کرتا ہے اور اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم ہماری ضروریات کے تحت نہیں بلکہ غیر ملکی سوچ کا مرہونِ منت ہے۔

اسکول اور کالج کا طالب علم جو کہ علاقائی زبان بولنے والا ہو۔ وہ اسکول میں دس سال تک ایک زبان، گھر میں اپنی مادری زبان اور پھر کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر ایک تیسری زبان میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اس کا علم حاصل کرنے کا زیادہ وقت ان زبانوں پر عبور حاصل کرنے میں لگ جاتا ہے۔ نتیجۃً وہ طالب علم جو کہ اونچے اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ساری تعلیم انگریزی میں حاصل کرتے ہیں۔ بہترین روزگار اور موقعوں سے فائدہ اٹھا پاتے ہیں۔ یہاں آ کر ہمارا تعلیمی نظام معاشرے میں موجود عمومی طبقاتی جبر کی ایک کڑی میں جڑ جاتا ہے۔ اور معاشرے کا سب سے اہم حصہ سماج میں موجود طبقاتی جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایک اور پہلو جو کہ ہمارے حکمران اور ماہر طبقات کی سازش کی آگاہی کراتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر علاقائی اور قومی زبانوں میں تعلیم دی جانے لگے تو ہمارے ہاں کے بہترین طلباء کی باہر کے ممالک میں منتقل ہونے کی رفتار میں کمی آئے گی۔

آخر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ مغربی ممالک کو اس نظام سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد بہت سے ممالک کو سامراجی طاقتوں سے آزادی ملی لیکن بہت سے ممالک اس نوآبادیاتی نظام سے نکل کر جدید نوآبادیاتی نظام کے جنگل میں پھنس گئے۔ پاکستان بھی انہی ممالک کے زمرے میں آتا ہے۔ اب ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کا استحصال دوسرے طریقے سے شروع ہوا۔ جدید نوآبادیاتی سوچ اور طریقۂ کار کے ذریعے ایسے ممالک ان ترقی یافتہ مغربی ممالک کی تجارتی منڈیاں بن گئے جن سے ان مغربی ممالک نے تمام تجارتی فوائد حاصل کرنا شروع کیے۔ ان فوائد کے حصول کے لیے بڑی بڑی کارپوریشنیں اور مالیاتی ادارے وجود میں آئے جنہیں آج ہم ٹرانسنیشنل کمپنیوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ان اداروں کو چلانے کے لیے خصوصاً ان ممالک میں جہاں سے تجارتی فوائد حاصل کیے جائیں ان کو اپنے لیے ملازمین بھی چاہئیں۔ اور اپنے معیار کے مطابق ایسے ملازمین حاصل کرنے کے لیے ان اداروں نے ترقی پذیر ممالک یا اپنی تجارتی منڈیوں میں ایسے مراعات یافتہ ادارے بنائے جن میں بہترین طالب علم ٹرانس نیشنل کمپنیوں کی ضروریات کے تحت پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کریں۔ لہٰذا ان تعلیمی اداروں میں صرف وہی طالب علم پہنچ سکتے ہیں جو کہ اپنی پچھلی تعلیم بہترین اسکولوں میں حاصل کر کے آئے ہوں اور تعلیمی خرچ برداشت کرنے کی حیثیت رکھتے ہوں۔ اس کے علاوہ ان میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے مشکل امتحانات سے گزرنا پڑے۔ دوسرے الفاظ میں ایسا طالب علم جو کہ مالی وسائل رکھتا ہو، ذہین ہو ان اداروں میں پڑھتا ہے اور ان کارپوریشنوں اور مالی اداروں میں ملازمت اختیار کرتا ہے۔

ان اداروں میں بھی جو طالب علم بہترین ذہنی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے اس کو مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے اور اس طرح طالب علموں کی شکل میں ملک اپنے بہترین دماغ ان تجارتی منڈیوں کے ساہوکاروں کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے تعلیمی اداروں سے نکلے ہوئے طالب علم یا تو انہی اداروں میں ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ یا پھر ملک کی معاشی اور تجارتی صورتحال جو کہ ناگفتہ بہ ہے اس میں طالب علموں کا ایک چھوٹا سا حصہ کھپ جاتا ہے اور باقی روزگار کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

اس طرح نوجوان ذہانت کا انخلاء بڑی تیزی سے جاری ہے جس کی قیمت ہمارے پورے سماج کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اور مغربی مالیاتی اور تجارتی ادارے ہماری بہترین ذہنی صلاحیت کو بغیر کوئی قیمت ادا کیے اپنے پاس گروی رکھ لیتے ہیں۔ اس طرح پوری سوسائٹی کو سماجی اور معاشی نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور یہ ادارے سماجی ترقی کے عمل کو سست کرنے کی سازش میں مصروف ہیں۔

جب سارا عالم سوتا ہے

اے خیّام

بالزاک کے شب و روز اور روز و شب

مشہورِ عالم فرانسیسی ادیب بالزاک نے اپنے روزمرّہ کے اوقات کو زیادہ سے زیادہ کار آمد بنانے کے لیے اپنے روزمرّہ یا ٹائم ٹیبل کو بالکل اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ شام کے چھ بجے وہ سو جاتا۔ اپنے ملازم کو اس نے سختی سے ہدایت دے رکھی تھی کہ اُسے کسی بھی قیمت پر اٹھایا نہ جائے۔ آٹھ بجے کے قریب، جب اس کے دوست احباب ہوٹلوں، سینماؤں اور تھیٹروں میں جانے کی تیاریاں کر رہے ہوتے، بالزاک اپنی خوابگاہ میں خراٹے لے رہا ہوتا۔ نو بج جاتے، دس بج جاتے، بالزاک سویا رہتا۔ گیارہ بجے لوگ تھیٹروں، سینماؤں سے واپس لوٹتے تب بھی بالزاک محوِ خواب ہوتا۔ آدھی رات سے کچھ قبل، جب پیرس اندھیرے میں ڈوبنا شروع ہوتا، بالزاک اپنے بستر میں پہلو بدلنا شروع کرتا۔

بارہ بجے وہ اٹھ بیٹھتا۔ اس وقت بیشتر شہر سو چکا ہوتا، بالزاک کو یقین تھا کہ اب وہ تنہائی میں امن و سکون سے آٹھ دس گھنٹے لکھنے میں گذار سکتا ہے۔ اس درمیان نہ تو کوئی شناسا ملنے کے لیے آئے گا، نہ کوئی خط اور نہ پبلشروں کی طرف سے کوئی شخص پروف کی تصدیق کرانے آئے گا۔ اس وقت وہ کسی بھی طرح کی خلل اندازی سے آزاد ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ ذہن کی بھٹی ایک بار تپ جائے تو پھر کوئی بھی چیز آسانی سے اسے ٹھنڈا نہ کر پائے گی۔

"خیالات میرے دماغ میں اس طرح لہریں لیتے ہیں جیسے کسی آبشار سے پانی گرتا ہے"۔ بالزاک اکثر کہتا۔ "رات کے سناٹے میں اپنی میز کے سامنے بیٹھتا ہوں۔ تنہا، خاموش، بغیر کسی خلل اندازی کے۔ اور معلوم نہیں کہاں سے خیالات جملے، کردار اور واقعات میرے ذہن میں درانہ گھستے چلے آتے ہیں ان موقعوں پر دو تین گھنٹے مجھے بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنے کے لیے لگاتار مجھے کئی گھنٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

آدھی رات گئے بالزاک اٹھتا تو اپنا مخصوص لباس زیب تن کرتا۔ پادریوں کا سا سفید چغہ، خاصا ڈھیلا ڈھالا جس میں جسم کو آسانی سے حرکت دی جا سکتی، ہلکا پھلکا اور ساتھ ہی گرم بھی۔ چغے کے اوپر اپنی کمر کے پاس بالزاک سونے کی زنجیر باندھتا جس سے صلیب کی بجائے ایک چھوٹا سا چاقو اور ایک قینچی بندھی ہوتی۔

اس کے احباب اس کے لباس پر اس کا مضحکہ اُڑاتے۔ وہ کہتے کہ وہ راہب بنتا جا رہا ہے۔ ان کی یہ بات کسی حد تک درست بھی تھی۔ اگر بالزاک کو ایسا ہی ڈھیلا ڈھالا لباس پسند تھا تو وہ ڈریسنگ گاؤن کا انتخاب بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اُس کے پاس سردیوں کے لیے گرم چغے تھے اور گرم موسم کے لیے ریشمی چغے۔ یہ چغے انتہائی صاف ستھرے ہوتے۔ ہلکا سا داغ دھبا بھی بالزاک کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ خاص طور پر روشنائی کا داغ دیکھ کر تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔

آدھی رات گئے بالزاک تیار ہو کر کچن میں جاتا اور کافی کی ایک دو پیالیاں پیتا۔ ہاتھ پیروں کو ورزش کے سے انداز میں حرکتیں دیتا اور نیند کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جاتا۔

اب وہ پوری طرح چاق چوبند ہو کر اپنے کمرے میں جاتا جہاں بیٹھ کر وہ لکھا کرتا تھا۔ میز پر سبز رنگ کا اونی میز پوش بچھا ہوتا، یہ رنگ اس کی آنکھوں کو بڑا بھلا لگتا تھا اور اس پر کاغذ رکھ کر لکھتے وقت قلم پر ضروری دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔

اس کے بائیں طرف چاندی کا شمع دان ہوتا جس میں روزانہ چھ موم بتیاں لگا دی جاتیں۔ اس کی روشنی صرف میز کا احاطہ کرتی جبکہ سارا کمرہ تاریک رہتا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر اتنے دبیز پردے ہوتے کہ ان سے چھن کر نہ روشنی اندر آ سکتی تھی اور نہ آوازیں۔ بالزاک جب اپنے کام میں محو ہوتا تو اُسے چاندنی اور تاروں کی روشنی بھی گراں گذرتی۔ دائیں طرف رات بھر کے استعمال کے لیے کئی قیمتی قلم پڑے ہوتے جو پہاڑی کوّے کے پروں سے بنے ہوئے ہوتے۔ قریب ہی روشنائی سے بھری ہوئی دوات ہوتی اور اس کے علاوہ ایک سربند دوات اور بھی موجود ہوتی۔ بالزاک ایک بار لکھنا شروع کر دیتا تو پھر کوئی بھی رکاوٹ اُسے سخت گراں گذرتی۔

شمع دان کے قریب سبز رنگ کی ایک کاپی پڑی ہوتی۔ اس میں بہت سے افکار، خیالات، جملے، محاورے وغیرہ لکھے ہوتے، لکھنے کے دوران ان کی ضرورت بھی پڑ سکتی تھی۔

بالزاک لکھنے بیٹھتا تو خود کو مخاطب کرتا۔ "اب شروع ہو جاؤ بالزاک، لکھنے کا وقت ہو گیا ہے۔" پھر اس کا قلم ہلکے نیلے رنگ کے بہت ہی قیمتی کاغذ پر دوڑنے لگتا۔ اور بغیر رکے آٹھ، دس، بارہ گھنٹوں تک دوڑتا رہتا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ لگاتار سولہ گھنٹوں تک دوڑتا رہتا۔

بالزاک کے خیالات کی رفتار اس کی تحریر سے زیادہ تیز ہوتی۔ کئی بار قلم اس کے خیالات کا بالکل ساتھ نہ دے پاتا۔ ایسی صورت میں بالزاک الفاظ یا جملوں کو ادھورا چھوڑ کر ہی آگے بڑھ جاتا۔ اس کی ایسی تحریریں پیرس کے کمپوزیٹروں کے لیے دردِ سر بن جاتیں۔ اس کے الفاظ اور جملے ادھورے ہی نہیں بلکہ ٹیڑھے ترچھے اور غیر واضح بھی ہوتے۔

پانچ چھ گھنٹوں کی نشست کے بعد بالزاک کے خیالات کی رفتار تو وہی رہتی لیکن اس کا جسم شکایت کرنے لگتا، آنکھیں درد کرنے لگتیں اور سر میں کچھ ٹوٹ پھوٹ سی ہونے لگتی۔ اس کی گردن اور کمر کے پٹھے اکڑ جاتے۔ دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اور انگلیاں سُن ہو جاتیں اور اس کے اندر ایک ایسا ذہنی تناؤ پیدا ہوتا کہ موم بتی کی لو بھی پھڑکتی تو وہ چونک اٹھتا۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود اُسے قلم میز پر رکھ دینا پڑتا۔ کرسی سے اٹھتا، انگڑائیاں لیتا، دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو کھینچتا اور کنپٹیوں کو ملتا۔ پھر سر کو اس طرح جھٹکتا جیسے کتّا پانی سے نکل کر اپنے سر کو جھٹکتا ہے۔

"بالزاک۔ کافی پیو گے؟" وہ اونچی آواز میں خود سے پوچھتا اُسے تمباکو سے نفرت تھی اور شراب اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن وہ کافی کا رسیا تھا۔ وہ خوب گاڑھی کافی بناتا اور دو تین پیالیاں لگاتار پی جاتا۔

صبح کے آٹھ بجے بالزاک اپنی نشست سے اُٹھتا اور گھنٹی بجا کر اپنے ملازم آگسٹے کو ہوشیار کر دیتا۔ آگسٹے کچھ ہی دیر میں چاندی کی ٹرے میں ناشتہ سجا کر حاضر ہو جاتا۔ بالزاک کی ہدایت کے مطابق وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتا۔ خاموشی سے ٹرے میز پر رکھتا۔ کمرے کے پردے ایک طرف سرکا دیتا اور موم بتیاں بجھا دیتا۔

بالزاک خود اُسے "صبح بخیر" کہتا اور کافی کی پیالیاں خالی کرتے ہوئے سڑک پر سے آنے والی آوازوں پر کان لگا دیتا۔ اسکول جانے والے بچوں کی آوازیں، کوچوانوں کی آوازیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں۔ یہ آوازیں اُسے کسی دوسری دنیا کی آوازیں محسوس ہوتیں

جب وہ ناشتے میں مشغول ہوتا تو آگسٹے اس کے نہانے کے لیے ایک بڑے ٹب میں گرم پانی ڈال دیتا۔ وہ ٹب بالزاک نے خاص طور پر لندن سے منگوایا تھا، کیونکہ پیرس میں ویسا ٹب دستیاب نہیں تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ نپولین گھنٹہ بھر پانی میں لیٹ کر نہایا کرتا تھا۔ اس نے خود بھی ویسا ہی طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح اس کا ذہنی تناؤ کم ہو جاتا اور وہ فرحت و تازگی محسوس کرنے لگتا۔

نہا کر کمرے سے نکلتا تو بہت سے لوگ اُس سے ملنے کے لیے دوسرے کمرے میں انتظار کر رہے ہوتے۔ پریس سے آئے ہوئے پروف کی تصدیق کرانے والے لوگ، اخبار اور رسالوں کے لیے نئی تحریریں حاصل کرنے کے لیے پبلشر حضرات، اپنی مشکلات اور دشواریوں کے سلسلے میں مشورے حاصل کرنے کے لیے کچھ نوجوان، رومانی مزاج رکھنے والی اس کی پرستار لڑکیاں اور ایسے بہت سے دوکاندار جن کا وہ قرضدار تھا۔

بالزاک اُن سب کو کسی طرح نمٹاتا اور دوپہر تک پروف ریڈنگ کرتا۔ یہ کام بھی یکسوئی کا تقاضا کرتا۔ دوپہر میں وہ ہلکا پھلکا کھانا کھاتا۔ کھانے کے بعد وہ پھر اپنی میز پر بیٹھ جاتا۔ ڈاک دیکھتا اور خطوں کے جواب لکھتا۔ اپنی سبز کاپی میں خیالات تحریر کرتا۔ ایک دو رسالوں کے لیے مضامین لکھتا اور پانچ بجے تک کام ختم کر کے اُٹھ جاتا شام کے چھ بجے جب لوگ ملنے ملانے کے لیے نکلتے، بالزاک سونے کی تیاری شروع کر دیتا۔ بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آ جاتی، خوابوں سے بے نیاز، گہری نیند۔ اس کے چاروں طرف پیرس رنگ رلیاں منا رہا ہوتا اور وہ خود سویا رہتا۔ آدھی رات کے وقت آگسٹے اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دیکر اُسے جگاتا اور اس کے لکھنے کے لیے مخصوص کمرے میں جا کر شمع دان روشن کر دیتا۔ بالزاک کافی پی کر لکھنے میں مصروف ہو جاتا، کام کی ایک اور رات شروع ہو جاتی۔

فرانس کا وہ ادیب، عظیم فلسفی کارل مارکس جس کے عاشقوں میں تھا

کراچی کے عوام اور بجلی کا نظام

خاور

کے ای ایس سی میں مزدور سیاست آج بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔

کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (کے ای ایس سی) کراچی کے لیے بجلی فراہم کرنے کا ذمہ دار ادارہ ۱۹۱۳ء میں قائم کیا گیا۔ شروع شروع میں شہر کی آبادی کم ہونے کی وجہ سے صارفین کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اور کے ای ایس سی کی انتظامیہ اور افسر خود بڑھ چڑھ کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کنکشن حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ کنکشن حاصل کرنے کا طریقۂ کار شروع میں اس طرح کا تھا کہ کنکشن حاصل کرنے کے لیے ایک ہی سیکشن کو پوری ذمہ داری دینے کی بجائے علیحدہ علیحدہ سیکشن اس طرح بنائے گئے کہ کسی ایک سیکشن کو اجارہ داری قائم کرنے یا من مانی کرنے کا موقع ہی سرے سے نہ مل سکے۔ مختلف طریقوں سے ان شعبوں کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس لیے رشوت یا تو بالکل نہیں تھی یا پھر بہت ہی محدود تھی۔

قیام پاکستان کے بعد اور پھر ون یونٹ کے قیام سے اس ادارے کی کارکردگی بھی بہت متاثر ہوئی۔ ایک طرف گھریلو صارفین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا تھا تو دوسری جانب صنعتی اور تجارتی صارفین کی طرف سے بھی بجلی کی زیادہ کھپت ہونے لگی۔ ان تمام حالات کا تقاضا یہ تھا کہ کے ای ایس سی نہ صرف اپنی پیداواری صلاحیت میں اضافے پر توجہ دے بلکہ تمام صارفین تک بجلی فراہم کرنے کے طریقۂ کار پر بھی نظرِ ثانی کرے تاکہ کنکشن پہلے کی طرح جلدی فراہم ہو سکے۔

کے ای ایس سی کی انتظامیہ نے بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے تو کچھ نہ کچھ توجہ دی لیکن کارخانوں، دکانوں اور کاروباری اداروں تک بجلی فراہم کرنے کے طریقۂ کار کو جوں کا توں رکھا گیا اور حالات کی روشنی میں تقسیم اور ترسیل کے نظام کو ترتیب نہیں دیا گیا۔ یہاں سے وہ مرض شروع ہوا جس کی سزا آج تک کراچی کے عوام بھگتتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ حکمرانوں نے ہر جگہ، ہر ادارے میں اپنے ذاتی، گروہی اور طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے من پسند لوگوں کو مختلف عہدوں پر فائز کرنا شروع کر دیا۔ ہر جگہ چونکہ انتظامی سربراہ بھی عموماً پنجاب یا کسی دوسرے صوبے کا ہوتا تھا اس لیے کے ای ایس سی تقریباً تمام آسامیوں پر بھی ان ہی علاقوں کے لوگوں کا قبضہ ہوتا چلا گیا، نتیجے میں اور تو اور اس ادارے میں مزدور انجمنیں بھی انتظامیہ نے اپنے ہی آدمیوں کی مدد سے بنوا ڈالیں۔ جس کی وجہ سے کے ای ایس سی میں آج بھی مزدور سیاست نہ ہونے کے برابر ہے۔ تمام مزدور تنظیمیں لسانی اور علاقائی برادریوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ کے ای ایس سی کے مزدور کسی بھی سیاسی جدوجہد میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکے ہیں۔

اس کے علاوہ چونکہ پنجاب یا ہزارہ وغیرہ سے اکثر لوگوں کو اس ادارے پر قابض کیا گیا جو بارش، گرمی اور عید وغیرہ کے دنوں میں واپس اپنے "وطن" چلے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں اسی عرصے کے دوران بجلی کے نظام کو درست رکھنے والے عملے کی کمی آج بھی محسوس ہوتی ہے اور کام متاثر ہوتا ہے۔ اگر کوئی ملازم ان علاقوں کا یہاں

۹ لاکھ صارفین کے لیے اٹھارہ افسر اور گیارہ ہزار مزدور، لیکن کارکردگی مایوس کن۔

پر رہتا بھی ہے تو چونکہ اس کا یہاں کے عوام سے کوئی سماجی رشتہ ہی نہیں بن پاتا۔ اس کی وجہ سے وہ کام کرنے میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں رکھتا۔ پھر جب مزدور یونین بھی "اپنی برادری" کی ہونے لگی تو یہاں تک نوبت پہنچ چکی کہ کارکن ہزارہ میں ہی بیٹھ کر حاضری لگوا رہا ہے، تنخواہ اور اوور ٹائم بھی باقاعدگی سے حاصل کر رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے ان حالات کے ردِ عمل میں اگر کبھی کوئی یونین باہر کی

پہلے کے ای ایس سی کی انتظامیہ لوگوں کو کنکشن لینے کی ترغیب دیا کرتی تھی۔

برادری کے ہاتھ سے نکل کر مقامی برادریوں کے ہاتھ میں آ گئی تب بھی اسکا کردار مختلف نہ ہو سکا۔ یہ رجحان آج بھی نہ صرف حاوی ہے بلکہ پختہ ہو چکا ہے۔

اس وقت اس ادارے میں ۱۸۰۰ انجینیرز اور افسر ہیں جبکہ گیارہ ہزار مزدور ہیں اور ۹ لاکھ صارفین ہیں، آج یہ ادارہ کراچی کے علاوہ ایک طرف گھارو اور دھابیجی تک بجلی فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے تو دوسری جانب حب، بیلہ اور اوتھل کو بھی یہی بجلی بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کے ای ایس سی نے کنکشن حاصل کرنے کے لیے ترسیل اور تقسیم کا جو طریقۂ کار شروع میں رائج کیا تھا آج تک وہی چل رہا ہے۔ شہر کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ صارفین کی تعداد میں زمین آسمان کا فرق ہو چکا ہے۔ سیاسی اور سماجی حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ کارکنوں پر کام کا دباؤ اور بجلی کی کھپت میں ہوشربا اضافہ ہو چکا ہے لیکن ادارہ جوں کا توں ایک جگہ رکا ہوا ہے۔ نتیجے میں انتظامی تضادات ابھر کر سامنے آ چکے ہیں۔ ادارہ منافع بخش ہے لیکن طریقۂ کار کو بہتر بنانے کے لیے یہ منافع خرچ نہیں ہوتا۔ حکمرانوں کی ترجیحات مختلف ہیں۔ غیر منافع بخش مدوں میں رقوم خرچ کی جا رہی ہیں۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ گیارہ ہزار ملازمین میں سے کام کرنے والوں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہو گی۔ مزدور تنظیموں میں شامل لوگ برملا کام سے یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ "جی ہم لیڈر ہیں"۔ صرف C.B.A سودا کار ایجنٹ کے چیدہ چیدہ ورکرز کا یہ حاصل نہیں ہے بلکہ جو لوگ کام نہیں کرنا چاہتے ان کا کام ہی یہ ہے کہ "نئی تنظیم" کے نام سے سامنے آ جاتے ہیں یا پہلے سے موجود تنظیم کا لیڈر ہونے کی دھونس چلاتے ہیں۔ اور یہ رویہ چند لوگوں کا نہیں بلکہ خاصی بڑی تعداد کا ہے۔ احساس ذمہ داری کا فقدان اور بدنظمی شاید اس نظام کا منطقی یا فطری نتیجہ ہے۔ ان حالات اور واقعات کی سزا کراچی کے عام شہریوں کو عرصے سے مل رہی ہے اور اس صورت حال کے بارے میں کوئی داد فریاد نہیں ہے۔ ٹریڈ یونین کو صحت مند بنیادوں پر منظم کرنے والا کوئی نہیں ہے جس کی وجہ سے نہ صرف کراچی کے شہری مشکلات کا شکار ہیں بلکہ مزدور تحریک کو بھی ناقابل تلافی نقصان ہو رہا ہے۔۔۔۔ دھونس، رشوت، سفارش اور برادری یا نسلی بنیادوں پر بھرتی ہو رہی ہے لیکن جو اسٹاف بھرتی ہو رہا ہے وہ کام نہیں کرتا کیونکہ وہ آیا ہی دوسرے طریقے سے اور دوسرے کام کے لیے ہے۔ اوور ٹائم، بونس اور دیگر سہولیات گھر بیٹھے اور اپنا پرائیویٹ کام کرتے ہوئے بھی حاصل رہیں تو اور کیا چاہیے؟؟

کراچی کے عوام، سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونین لیڈروں اور کراچی الیکٹرک سپلائی انتظامیہ کو اس طرف توجہ دینی ہو گی ورنہ یہ صورت حال اگر اسی طرح چلتی رہی تو ایک دن وہ بھی آئے گا کہ ہم کفِ افسوس بھی نہ مل سکیں گے۔

سوویت معاشرے میں تبدیلیاں

سعید رضا سعید

دنیا کی پہلی سوشلسٹ ریاست سوویت یونین کے بارے میں کوئی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ نہ لفظ سوشلسٹ کسی خوفناک شے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نہ لفظ سوویت کوئی شیطانی کلمہ ہے۔ ایک منظم معاشرے یا برادری کو سوسائٹی کہتے ہیں۔ ہم رات دن سوسائٹیاں بناتے رہتے ہیں۔ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے کو سوشل کہا جاتا ہے۔ سوشل کے معنی ہیں ملنا، مہذب، نرم خو۔ سنسکرت میں یہی لفظ 'سوشیل' ہے۔ سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والوں اور اس کام سے دلچسپی رکھنے والوں کو سوشلسٹ کہا جاتا ہے۔ یہ سارے الفاظ عظیم اکتوبر انقلاب سے بہت پہلے وجود میں آچکے تھے۔ یہ سارے الفاظ قدیم لاطینی زبان کے لفظ 'سوشس' سے نکلے ہیں جس کے معنی ہیں 'ساتھی'۔

سوویت عربی زبان کا لفظ ہے (صحیح عربی تلفظ سَوِی/یَت) اس کے معنی ہیں رواداری اور پنچایت۔ عظیم اکتوبر انقلاب کے بعد ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے رواداری پر مبنی پنچائتی نظام رائج کیا گیا۔ پنچائتی طرز پر چلنے والی ملک کی متحدہ ریاستوں کی یونین کا نام سوویت یونین قرار پایا۔ مولانا حسرت موہانی کا مصرعہ ہے:۔

"اخوت ہے جہاں میں ہوں، سُویت ہے جہاں میں ہوں"

اسی طرح کمیون (میم پر تشدید) فرانسیسی زبان کا پرانا لفظ ہے۔ جس جگہ کچھ لوگ مل جل کر رہتے ہوں۔ ساری آمدنی مشترکہ طور پر سب کے لیے خرچ کی جاتی ہو قطع نظر اس کے کہ کون کتنا کماتا ہے یا بالکل نہیں کماتا تو اس اشتراک عمل یا مشترکہ زندگی کو کمیون کہتے ہیں۔ .... کمیون کے نظام کے حامی کو کمیونسٹ یعنی اشتراکی کہا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان الفاظ کو کسی دوسری دنیا کے الفاظ سمجھ کر ان سے ڈرنے یا بدکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مارکس اور اینگلز کا سارا فلسفہ روس سے باہر کا ہے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو یورپ میں لکھا گیا۔ اسی وقت سے دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہ نظام رائج کرنے کی کوشش جاری ہو گئی جو آج تک جاری ہے۔ مارکس کے نظریے کو عملی شکل دینے میں کامیابی لینن کے حصے میں آئی جن کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں زار روس کی شہنشاہیت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

انقلاب سے پہلے روس میں آرتھوڈوکس چرچ سرکاری مذہب تھا۔ مسلمانوں اور دوسرے عقائد ماننے والوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا تھا۔ لینن نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ اب حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ سارے مذاہب حکومت کی نظر میں یکساں اور برابر ہیں (اس وقت دنیا میں یہ پہلی حکومت تھی جو سیکولر قرار دی گئی تھی۔ سیکولر کا ترجمہ 'لامذہب' غلط ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکومت کا اپنا مذہب کوئی نہیں ہے۔ اس کی نظر میں سارے لوگ برابر ہیں محض اس بنا پر سامراجی ذرائع ابلاغ نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ سوویت یونین میں مذہبی آزادی نہیں ہے۔ آج دنیا میں بہت سے ملک سیکولر ہیں لیکن یہ الزام صرف سوویت یونین پر ہے۔)

نئی حکومت نے جاگیرداروں کی ساری زمین بلا معاوضہ ضبط کر کے کسانوں میں بانٹ دی۔ جو تھوڑی بہت صنعتیں تھیں وہ اور کانیں، تیل کے کنوئیں سب ریاست کی ملکیت قرار دیے گئے اور ریاست پرولتاری طبقے کی قرار پائی (پرولتاری اسے کہتے ہیں جو محنت بیچ کر پیسہ کماتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو پیسہ لگا کر پیسہ کماتا ہے وہ بورژوا کہا جاتا ہے۔ بڑا بورژوا سرمایہ دار ہوتا ہے) گویا سوویت یونین نے سب سے پہلے یہ طے کر دیا کہ اب یہاں بندوں کو گنا جائے گا، تولا نہیں جائے گا۔

یہ بڑی لمبی کہانی ہے کہ جاگیردار خاندانوں نے جن کے افراد زار شاہی فوج کے بڑے افسر بھی ہوا کرتے تھے، اپنے وسائل، سامراجی طاقتوں کی مدد، اپنی باقاعدہ فوجی تربیت اور پادریوں اور ملاؤں کے فتووں کے بہکائے ہوئے کسانوں کو لے کر وائیٹ گارڈز اور بلیک گارڈز کے نام سے فوجی جتھے بنا لیے اور پورے ملک میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ یہ لوگ قصبوں کے بازاروں سے گولیاں برساتے گزر جاتے تھے۔ گاؤں والوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روند ڈالتے تھے۔ اناج کے ذخیرے اور کھڑی فصلیں جلا دیتے تھے۔ پل گرجوں اور مسجدوں کو بم مار کر اڑا دیتے تھے اور سامراجی ذرائع ابلاغ ساری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے کہ یہ حرکتیں کمیونسٹ کر رہے ہیں (یہی ساری باتیں افغانستان میں بھی دہرائی جا رہی ہیں) بالآخر کمیونسٹوں نے کسانوں، مزدوروں، طالب علموں اور زار شاہی فوج کے ادنیٰ سپاہیوں کی مدد سے ان سب کو شکست دی اور ملک میں امن قائم ہو گیا۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ زمینیں کسانوں کی ابتدائی ملکیت میں دی گئیں تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زراعت میں مشینیں رائج ہو رہی تھیں۔ تجربے نے سکھایا کہ کھیت جتنا بڑا ہو گا مشینی زراعت اتنی ہی زیادہ مفید اور باکفایت ہو گی اس لیے کسانوں نے رفتہ رفتہ رضاکارانہ طور پر پنچایتی فارم بنانا شروع کر دیے۔ ایسے بھی لوگ تھے جنہیں پنچایتی فارم میں اپنی زمین شامل کرنے کا فیصلہ کرنے میں کئی کئی برس لگے۔ بہرحال اس سلسلے میں کوئی جبر نہیں کیا گیا۔

گورباچوف نے وسیع اصلاحی پروگرام کے تحت 'پریسترئیکا' اور 'گلاسنوت' ایک ساتھ رائج کیے۔ 'پریسترئیکا' کا مطلب ہے تعمیرِ نو اور تطہیر۔ گلاسنوت کا مطلب ہے کھلاپن۔ یوں تو اصلاحات ہر دور میں ہوتی رہی ہیں لیکن سوویت پریس انہیں اچھالتا نہیں تھا۔ (سوویت پریس کا رویہ ہمیشہ سے مغربی پریس کے رویے سے مختلف ہے۔ جب روس نے پہلا خلائی سیارہ اسپوتنک کامیابی کے ساتھ خلا میں پہنچایا تو بمبئی کے ایک صحافی ظ۔ انصاری اتفاق سے روس میں موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں کے اخباروں میں یہ خبر بہت معمولی انداز میں شائع ہوئی۔ انہوں نے کہا" میں نے روسیوں سے اس سلسلے میں بات کی مگر وہ بھی اسے روزمرّہ جیسی عام بات تصور کرتے تھے"۔ یہی کارنامہ اگر کوئی مغربی ملک انجام دیتا تو ذرائع ابلاغ میں بھونچال آجاتا۔ بہرحال یہ اپنا اپنا انداز ہے) گلاسنوت کے تحت سوویت ذرائع ابلاغ کے انداز کو قدرے بدلا گیا ہے اور خبروں کی اہمیت کے پیمانے تبدیل کر کے انہیں کسی حد تک مغربی پیمانوں سے قریب لایا گیا ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ ۱۹۱۷ء سے ہی یہ پیش گوئی کرتے چلے آرہے ہیں کہ سوشلسٹ نظام معیشت فیل ہو جائے گا۔ ہر سال کھربوں ڈالر سوویت یونین کے خلاف پروپیگنڈے پر صرف کیے جاتے ہیں۔ اب یہ ذرائع ابلاغ گورباچوف کی اصلاحات کو بنیاد بنا کر یہ تاثر دے رہے ہیں کہ جیسے سوویت یونین میں سرمایہ دارانہ نظام واپس آرہا ہے۔ پاکستانی ذرائع ابلاغ بھی چونکہ سامراجی پروپیگنڈا مہم کے آلہ کار ہیں اس لیے ہمارے ہاں بھی یہ تاثر ان لوگوں میں پھیل رہا ہے جن کی دسترس صرف مغربی ذرائع ابلاغ تک ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گورباچوف نے بہت بڑی اور دور رس تبدیلیاں کی ہیں لیکن یہ بات نہیں ہونی چاہیے کہ ان تبدیلیوں کا وقت آچکا تھا اور اس وقت گورباچوف کے بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو اسے بھی یہ تبدیلیاں کرنی پڑتیں۔ یہ البتہ ممکن تھا کہ ان کی رفتار اتنی تیز نہ ہوتی۔

یہاں ایک مثال سمجھ لیجئے۔ آپ اپنے ننھے بچے کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر فوراً چھین لیتے ہیں کہ کہیں وہ اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لے۔ سوویت یونین میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام ختم تو کر دیا گیا تھا لیکن ان خاندانوں کے افراد، رشتے دار، کارندے اور ان نظاموں سے فائدہ اٹھانے

سوشلسٹ معاشرہ اب بالغ ہو چکا ہے سارے مذاہب حکومت کی نظر میں یکساں اور برابر ہیں

والے معززین، عمائدین، ہر شہر، محلے، قصبے اور گاؤں میں موجود تھے۔ دوسروں پر ان کی مالی برتری اور پہلے والا اثر ورسوخ ختم ہو گیا تھا۔ پہلے لوگ انہیں جھک کر سلام کرتے تھے، کوئی کام کرانے کے لیے، ان کے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے۔ ان کی انا کی تسکین کے یہ ذرائع ختم ہو گئے تھے۔ پس ان لوگوں کو ذرا بھی چھوٹ دی جاتی تو یہ سرمایہ دارانہ نظام کو چھوٹے پیمانے پر بحال کرنے کی راہیں نکال لیتے۔ یہ پوری نسل جس نے لوٹ کھسوٹ کا استحصالی نظام دیکھا تھا، اسے سیکھا تھا اور اس سے فائدہ اٹھایا تھا ختم ہو گئی۔ اس نسل کی گود میں پرورش پانے والی نسل نے بھی استحصال کے طور طریقے اپنے بزرگوں سے سُن رکھے تھے۔ جب اتنا وقت گزر گیا کہ یہ نسل بھی ختم ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب سوشلسٹ معاشرہ بالغ ہو گیا۔ اور بچہ جب بڑا ہو جائے تو اسے چاقو استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

آئیے اب مختصر طور پر یہ دیکھیں کہ وہاں کیا تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان میں چند یہ ہیں۔

نجی کام کا حق

یہ حق پہلے قطعاً نہیں تھا۔ لیکن پہلے بھی یہ ہوتا تھا کہ گھڑی سازی کی فیکٹری میں کام کرنے والا اپنے خالی وقت میں محلے والوں کی گھڑیاں ٹھیک کرتا تھا اور اس کام کی اجرت بھی وصول کیا کرتا تھا۔ گارمنٹ فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکی فارغ وقت میں اپنے گھر پر اُجرت لے کر کپڑے سیتی تھی۔ یہ کام چھپ کر کیا جاتا تھا اور قانون چشم پوشی سے کام لیتا تھا۔

اب اس بات کی کھلی اجازت دیدی گئی ہے۔ کام کرنے والا اپنے گھر کے افراد کو تو اس میں شریک کر سکتا ہے لیکن اُجرت پر کوئی مزدور نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے کہ جب آجر اور مزدور ہوں گے تو لازمی استحصال شروع ہوگا اور سوشلسٹ معاشرے میں استحصال کی اجازت نہیں ہے۔

ایسے لوگوں کو باقاعدہ حساب آڈٹ کرانا ہوگا اور ٹیکس بھی ادا کرنا پڑے گا۔ اس ٹیکس کی شرح تنخواہ پر لیے جانے والے آمدنی ٹیکس سے زیادہ ہوگی۔

زمین کا پٹہ اور موروثی حق

مغربی ذرائع ابلاغ اسے جاگیرداری نظام کی بحالی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ شروع سے پنچایتی فارموں اور ریاستی (سرکاری) فارموں کے ممبر گھرانوں کو ذاتی استعمال کے لیے ایک پلاٹ دیا جاتا ہے۔ اس پر وہ اناج، سبزیاں، پھل وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ ماہی پروری کرتے ہیں، مویشیوں کی افزائش نسل، پولٹری، ڈیری۔ غرض جو چاہیں وہ کرتے رہے ہیں۔

اس نجی فارم کی پیداوار خاندان کے اپنے خرچ کے لیے ہوتی ہے۔ فاضل پیداوار وہ حکومت کے ہاتھ، پنچایتی فارم کی انتظامیہ کے ہاتھ یا قصبے کی کھلی منڈی میں فروخت کر سکتے ہیں۔ ان فارموں پر گھرانے کے لوگ ہی کام کر سکتے ہیں اُجرت پر مزدور رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

سوویت یونین میں ساری زرعی اور رہائشی زمین ریاست کی ملکیت ہے۔ اسے خریدنے یا بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔ نجی فارم کے لیے پلاٹ پنچایتی یا ریاستی فارم کی انتظامیہ اپنی سہولت کے مطابق الاٹ کرتی تھی۔ جب مناسب سمجھتی تھی، ایک پلاٹ لے کر اس کی جگہ دوسرا پلاٹ دے دیتی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ پلاٹ کا پٹہ موروثی ہونا چاہیے تاکہ ہم اس پر پھلوں کے درخت لگائیں یا ماہی پروری شروع کریں تو ہماری نجی محنت ہماری اولاد کے بھی کام آئے چنانچہ یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس سے جاگیرداری کی راہیں ہرگز نہیں کھل سکتیں۔

یہ اجازت پہلے سے موجود ہے کہ جو لوگ نئی انجمن امداد باہمی بنا کر نیا پنچایتی فارم قائم کرنا چاہیں انہیں زمین مفت دے دی جاتی ہے۔ بلکہ آلات کاشتکاری، بیج، کھاد، کیڑے مار دواؤں اور تعمیرات کے لیے قرضہ بھی دے دیا جاتا ہے۔ (ذاتی مکان کے لیے بھی زمین مفت اور صرف ایک فیصد سود پر قرضہ ملتا ہے)

بیرونی تجارت کا حق

مغربی ذرائع ابلاغ بغلیں بجا رہے ہیں کہ اب روس میں بڑے بڑے ایکسپورٹر پیدا ہوں گے اور سرمایہ داری کی بنیاد پڑے گی۔ حالانکہ ایسا کوئی خدشہ ممکن ہی نہیں۔

پہلے تو یہ بات اہم ہے کہ براہ راست ایکسپورٹ کی اجازت کسی فرد کو نہیں بلکہ اشیائے صرف، الیکٹرانک آلات، مشینری اور دوسری چیزیں بنانے والی کوآپریٹوز کو مل سکتی ہے۔ فرد یا افراد کے کسی گروپ کو نہیں۔ دراصل اس اجازت سے دو فائدے حاصل ہوں گے۔

(۱) اب تک ایکسپورٹ سرکاری اداروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ بین الاقوامی منڈیوں میں سرمایہ دار ملکوں کے نمائندوں کے مقابلے میں سوویت نمائندے کم تجربہ کار ہوتے ہیں۔ اس کام کی تربیت کے مواقع بھی کم ہیں چنانچہ یہ طے پایا کہ بڑے پیداواری کوآپریٹوز براہِ راست ایکسپورٹ کریں گے تو زیادہ لوگوں کو تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملے گا اور پھر ان میں سے ایکسپورٹ کے سرکاری اداروں کے لیے بہترین لوگوں کا انتخاب آسان ہو جائے گا۔

(۲) جب عظیم اکتوبر انقلاب آیا تھا تو دنیا صنعتی ترقی کے ابتدائی دور میں تھی اور زار شاہی روس تو یورپ کے مقابلے میں بہت پسماندہ تھا۔ اس کے بعد سارے مغربی ملکوں نے سوویت یونین کا معاشی بائیکاٹ کر دیا (جو آج تک جاری ہے) ملک میں ہر شے کی قلت پیدا ہو گئی۔ اسے پورا کرنے کے لیے صرف مال تیار کرنے پر دھیان دیا گیا۔ ویرائٹی اور کوالٹی کو ثانوی سمجھا گیا۔ وقت کے لحاظ سے یہ بہت ضروری بھی تھا۔

اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ اشیائے صرف کی ڈیزائننگ ایک جگہ ہوتی ہے اور ہر جگہ اسی کے مطابق مال بننا شروع ہو جاتا ہے۔ ویرائٹی یعنی تنوع کی کمی مسلسل محسوس کی جا رہی تھی۔ یوں سمجھیے کہ اگر امریکہ کی دکانوں پر دس ہزار قسم کے مختلف سگریٹ لائٹرز دستیاب ہیں اور پاکستان میں سو قسم کے ملتے ہیں تو سوویت یونین میں صرف دس قسم کے۔ نئی اصلاحات کے تحت ڈیزائننگ کا کام کوآپریٹو ادارے خود بھی کریں گے۔ مثلاً مشینوں کے ڈیزائن تیار کرنا محض اعلیٰ انجینئروں کا کام نہیں ہوگا بلکہ ان مشینوں پر کام کرنے والے مزدوروں کا مشورہ بھی اس میں شامل ہوگا۔ اس سے مال کی کوالٹی یقیناً بہتر ہو جائے گی۔ براہ راست ایکسپورٹ کے ذریعہ بیرونی مانگ کا علم ہوگا اور پیداوار میں عالمی معیار اپنایا جا سکے گا۔

یہاں یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ براہ راست ایکسپورٹ کا حق بہت سوچ سمجھ کر دیا جائے گا جس کا ثبوت یہ ہے کہ پریسترائیکا کا آغاز مارچ ۱۹۸۵ء میں ہوا تھا۔ اس وقت سے جولائی ۱۹۸۸ء تک ماسکو میں رجسٹرڈ ۲،۵۴۸ کوآپریٹوز میں سے صرف ایک کو یہ حق دیا گیا تھا۔

انتخابات میں ایک سے زیادہ امیدوار

مغربی ذرائع ابلاغ سے متاثر لوگ سمجھ رہے ہیں کہ اب سوویت یونین کے انتخابات میں بھی اسی طرح جوتیوں میں دال بٹنے لگے گی جس طرح سرمایہ دارانہ نظام والے ملکوں میں بٹتی ہے۔ دراصل جن لوگوں نے سوویت انتخابی طریقہ کار کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں چنانچہ وہاں کے مروجہ انتخابی نظام پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

سوویت میں آمدنی کے لحاظ سے طبقوں کا وجود ختم کیا جا چکا ہے۔ آمدنی اور وسائل کے اعتبار سے پورے ملک میں صرف ایک یعنی پرولتاری طبقہ ہے۔ یعنی ورکنگ کلاس کسی کارخانے کے مزدور اور اسی کارخانے کے منیجر کی تنخواہوں میں فرق (سو فیصد سے بہت کم) ضرور ہے لیکن عملی زندگی میں یہ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً بہت ممکن ہے کہ مزدور اور منیجر ایک ہی بلاکوں کے دو فلیٹوں میں رہتے ہوں۔ اگر مزدور کے کنبے میں زیادہ افراد ہیں تو اس کا فلیٹ منیجر کے فلیٹ سے بڑا ہوگا۔ دونوں اپنی اپنی آمدنی کا پانچ فیصد مکان کے کرائے، بجلی، پانی، گیس، سنٹرل ہیٹنگ، سیوریج وغیرہ کی صفائی کیلیے دیتے ہوں گے۔ (ان فلیٹوں کی سالانہ مرمت اور رنگ روغن کا خرچ ان کے سال بھر کے کرائے سے زیادہ ہوتا ہے جو ریاست ادا کرتی ہے) ممکن ہے مزدور اور منیجر دونوں ایک ہی کلب کے ممبر ہوں دونوں کے بچے ایک ہی اسکول میں کھیلتے ہوں۔ پھر اوور ٹائم ملا کر مزدور کی آمدنی منیجر سے بڑھ جاتی ہوگی۔

سرمایہ دار ملکوں میں مختلف پارٹیاں مختلف طبقوں کے مفادات کی نگرانی کرتی ہیں۔ سوویت یونین میں ایک ہی طبقہ ہے اور ایک ہی پارٹی۔

پورے ملک کا اعلیٰ ترین انتخابی ادارہ سپریم سوویت ہے جو دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ ایک ایوان میں ممبروں کی تعداد آبادی کے تناسب سے ہوتی ہے (جیسے سرمایہ دارانہ نظام والے ملک کی پارلیمنٹ میں) دوسرا ایوان قومیتوں کا ہے۔ اس میں ہر قومیت کے ۲۵ نمائندے ہوتے ہیں۔ روسی فیڈریشن میں نامی ریاست ملک کی آدھی آبادی ہے اس کے نمائندے اور صرف چند لاکھ افراد کی قومیت کے نمائندے برابر ہوتے ہیں۔ کوئی قانون اس وقت تک نافذ نہیں کیا جا سکتا جب تک دونوں ایوان اسے منظور نہ کر لیں۔

اس طرح اکثریت کی بنا پر اقلیت کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جا سکتی ہے۔

سپریم سوویت کے علاوہ ریاستوں، خود مختار علاقوں، خطوں بھر شہروں، قصبوں، ضلعوں (سوویت یونین میں شہر کے اندر ضلع ہوتے ہیں) اور گاؤں کی سوویتیں ہوتی ہیں۔ کل سوویتوں کی تعداد ۵۲ ہزار سے اوپر ہے۔ اب یہ حیران کن بات سن لیجیے کہ چونکہ سپریم سوویت کے انتخاب میں ان لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے جنہوں نے انقلاب یا اس کے بعد ملک کی تعمیر اور دوسری جنگ عظیم میں ملک کے دفاع کے لیے سب سے زیادہ قربانیاں دیں۔ اس لیے اس ادارے میں ممبران کی اکثریت کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن ۵۲ ہزار سے اوپر دوسری سوویتوں میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جس میں کمیونسٹوں کی اکثریت ہو۔

وجہ یہ ہے کہ سوویت یونین میں ایک طبقہ اور ایک پارٹی ہے لیکن انتخابات پارٹی کی بنیاد پر نہیں ہوتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے کوئی ٹکٹ جاری نہیں کیا جاتا ہے۔

مروجہ طریقہ یہ ہے کہ انتخابات دو مرحلوں میں ہوتے ہیں۔ رائے شماری اور پولنگ پہلے مرحلے میں انتخابی حلقے کے ووٹروں کا ایک اجتماع ہوتا ہے جس میں مختلف لوگ حلقے کی نمائندگی کے لیے مختلف نام پیش کرتے ہیں۔ ان ناموں

آنکھوں کا اسپتال، ایک پولی ٹیکنیک۔ رقص اور موسیقی کا ایک اسکول، ایک پل، دو نئے بس روٹ، ایک ریلوے اسٹیشن وغیرہ وغیرہ بننے چاہئیں۔ مینڈیٹ اس حلقے کے کامیاب امیدوار کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہی اس کا منشور ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی سوویت میں اسے پیش کر کے منظور کرائے) عام طور پر مینڈیٹ منظور کر لیے جاتے ہیں اس لیے کہ ووٹر باشعور ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد اپنے نمائندے کو مشکل میں ڈالنا اور پریشان کرنا نہیں بلکہ علاقے کی مناسب ضرورتیں پوری کرانا ہوتا ہے۔

نمائندے کو ہر مہینے دو مہینے بعد اپنے ووٹروں کے سامنے آ کر بتانا پڑتا ہے کہ مینڈیٹ کا کون سا مرحلہ کس مرحلے پر ہے اور کب تک مکمل ہو جائے گا۔ مغربی طرز کی جمہوریت میں عام ووٹروں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ ان کا نمائندہ کیا کر رہا ہے۔ ایک الیکشن کے بعد اگلے الیکشن تک نمائندے اور ووٹر کا نہ صرف باہمی رابطہ ٹوٹ جاتا ہے بلکہ اس پر ووٹروں کا کوئی زور یا دباؤ بھی باقی نہیں رہتا۔

سوشلسٹ جمہوریت میں جس وقت بھی ووٹر یہ سمجھیں کہ ان کا نمائندہ ان کے مینڈیٹ پر عمل کرانے میں تسلی بخش کام نہیں کر رہا ہے، وہ ایک جلسہ کر کے عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر سکتے ہیں اور نمائندے کی رکنیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ حق محض کاغذی نہیں بلکہ عملی طور پر بار بار استعمال ہوتا ہے۔

کمیونسٹ مینی فسٹو پیپ میں لکھا گیا سوویت یونین میں ایک ہی طبقہ ہے اور ایک ہی پارٹی

کی حمایت اور مخالفت میں تقریریں کی جاتی ہیں تاکہ ووٹر یہ طے کر سکیں کہ حلقے کی نمائندگی کے لیے کون بہتر ثابت ہوگا۔ پھر رائے شماری ہوتی ہے۔ جس کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے ہیں وہ اس حلقے کا 'امیدوار' قرار دیا جاتا ہے (صرف امیدوار منتخبہ نمائندہ نہیں)۔

دوسرے مرحلے میں پولنگ ہوتی ہے۔ باقاعدہ پولنگ بکسوں میں ووٹ ڈالا جاتا ہے۔ ووٹ کی پرچی پر امیدوار کا نام لکھا ہوتا ہے۔ اس کے آگے 'ہاں' یا 'نہیں' کے خانے ہوتے ہیں۔ ووٹر کسی ایک خانے میں نشان لگا دیتا ہے۔ (اگر کسی حلقے کا نمائندہ اکثریت رائے سے مسترد کر دیا جائے تو یہ سارا عمل پھر سے ہوتا ہے)

الیکشن میں امیدوار کی جیب سے ایک پیسہ خرچ نہیں ہوتا کوئی زرضمانت نہیں ہوتا اور ووٹروں کے اجتماعات کا خرچ بھی حکومت برداشت کرتی ہے۔ جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ انتخابات محض ڈھونگ ہوتے ہیں وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ڈھونگ قسم کے انتخابات میں ووٹروں کی دلچسپی برائے نام ہوتی ہے۔ سوویت انتخابات میں نوے سے ننانوے فیصد تک پولنگ ہوتی ہے۔ آخر کیوں؟

یاد رہے کہ انتخابات کے لیے جب پارٹی ٹکٹ نہیں ہوتا تو کوئی انتخابی منشور بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بدلے ایک مینڈیٹ (MANDATE) ہوتا ہے جو ہر انتخابی حلقے کے ووٹر اپنے جلسے میں طے کر کے مرتب کرتے ہیں۔ اس میں درج ہوتا ہے کہ اس حلقے میں دس کنڈر گارٹن نرسریاں، دو پارک، ایک تیرنے کا تالاب، چھ زچہ خانے، ایک

نئی تبدیلیوں میں صرف یہ ہوگا کہ انتخاب کے پہلے مرحلے پر جو کئی امیدواروں کے نام آئیں گے ان پر رائے شماریاں نہیں ہوں گی بلکہ دوسرے مرحلے کی پولنگ میں سب کے نام شامل ہوں گے۔ زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے کو کامیاب قرار دیا جائے گا۔ باقی ساری شرطیں اسی طرح رہیں گی۔

مغربی ذہن کے لوگ اگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب غیر کمیونسٹ زیادہ تعداد میں کامیاب ہوا کریں گے تو وہ تو پہلے بھی ہوتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی نہ کوشش کی کہ سوویتوں میں اس کی اکثریت ہونی چاہیے۔ دنیا میں جمہوریت کے متعدد برانڈ ہیں۔ سوشلسٹ جمہوریت تجربوں اور اصلاحات سے گزر کر بنی ہے اور اصول یہ رہا کہ عام شہری کے حقوق بڑھتے جائیں۔

عدالتی نظام

شہری حقوق کا ذکر آیا ہے تو کچھ بات عدالتی نظام کی بھی ہو جائے۔ سوویت عدالتی نظام مغربی عدالتی نظام سے بہت مختلف ہے۔ ایک بنیادی فرق تو یہ ہے کہ مغربی عدالتی نظام میں کسی شخص پر الزام پہلے لگا دیا جاتا ہے اور اس پر یہ ذمہ داری ڈالی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرے۔ سوویت یونین میں ریاست کے خلاف سنگین جرائم کو چھوڑ کر باقی کسی جرم کے سلسلے میں بھی ملزم کو اس وقت تک گرفتار نہیں کیا جا سکتا جب تک استغاثہ جرم ثابت نہ کر دے۔ صفائی کے وکیلوں کا انتخاب فریق صفائی کی مرضی سے ہوتا ہے لیکن ان کی فیس حکومت ادا کرتی ہے مقدمے پر خرچ نہیں کرنا پڑتا ہے۔ ہر عدالت میں تین جج ہوتے ہیں جن میں ایک سرکاری ملازم ہوتا ہے۔ دو منتخب کیے جاتے ہیں۔ فیصلہ ججوں کی اکثریت رائے سے کیا جا سکتا ہے۔

عہدے کی موت

تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ ایک عہدے پر زیادہ عرصے تعینات رہنے سے آدمی ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اس کا جوش وخروش سرد پڑ جاتا ہے اور پہلے جیسی امنگ اور ولولہ باقی نہیں رہتا۔ پہلے لوگ کئی کئی عشروں تک ایک عہدے پر منتخب ہوتے رہتے تھے۔ اب یہ تبدیلی لائی گئی ہے کہ کوئی شخص ایک عہدے پر صرف دو مرتبہ مسلسل اور بہت بڑے عہدے کے لیے صرف تین مرتبہ مسلسل منتخب ہو سکتا ہے۔

پارٹی کے فرسٹ سکریٹریوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کسی سوویت کے چیرمین کا انتخاب بھی لڑیں۔ اس طرح انہیں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کے علاوہ منتخبہ اداروں کا اعتماد بھی حاصل کرنا ہوگا۔ اور پارٹی نے اُن پر جو اعتماد کیا ہے اس کی تصدیق ہو سکے گی۔

پریسترو ئکا کے تحت ایک جانب مرکزیت کو رفتہ رفتہ کم کیا جا رہا ہے دوسری طرف کرپشن کے امکانات کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چالیس فیصد سرکاری کاریں نیلام کر دی گئیں ہیں اس لیے کہ اب مرکز میں کام کم ہو جانے کی بنا پر اتنے زیادہ افسروں کی ضرورت نہیں ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ لینن کے اصولوں سے قطعی کوئی انحراف نہیں کیا جا رہا ہے۔ لینن کے سامنے کوئی عملی مثال نہیں تھی اس لیے انہوں نے شروع سے یہ اصول سکھایا کہ تجربوں سے سیکھو اور غلطیوں کی اصلاح کرو چنانچہ یہ عمل کسی نہ کسی شکل میں مسلسل جاری رہا ہے اور اب چونکہ سوشلسٹ معاشرہ بالغ ہو گیا ہے اس لیے سوشلسٹ جمہوریت اور پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ کو زیادہ مضبوط بنایا جا رہا ہے۔ اصول یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی کو مدنظر رکھا جائے۔

لعنت ہو اس قوم پر جو اُس وقت تک بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتی جب تک اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا نہ پڑ جائے

آج بازار میں پابجولاں چلو

فیض احمد فیض

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو
حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی
ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

انٹرنیشنل
مزدوروں کا عالمی ترانہ

اوژاں پوتیئے
ترجمہ: محمد میاں

جاگو اے فاقہ کے اسیرو
جاگو دنیا کے محرومو

انصاف گرج کر کہتا ہے
نیا جہاں پیدا ہوتا ہے

تقلید کی زنجیروں میں نہیں جکڑے
جاگو غلامو بندھن ٹوٹے

دنیا کی نئی بنیادیں ہوں گی
ہم کچھ بھی نہیں سب کچھ ہوں گے

اب آخری معرکہ آ پہنچا ہے
سب اپنی جگہ ڈٹ جائیں
بین الاقوامی
نسلِ انساں ہوگی

محتاج نہیں مہربانوں کے
ایوان سے جو حکم چلائیں ۔۔

مزدور نہ مانگیں خیرات ان سے
آؤ فیصلہ پکا کریں

چور سے لوٹ اگلوائیں
قید سے روح آزاد کریں

فرض ہے کیا ہم طے کریں
طے کریں اور خوب کریں

کھیت کارخانہ کے مزدور ملیں
سب محنت کش آپس میں ملیں

یہ دنیا ہم مزدوروں کی
جہاں جگہ نہیں کاہل کے لیے

کتنے ہمارے گوشت پہ پھولے
لیکن یہ گدھ خونخوار

اک صبح آسمان سے غائب ہوں گے
وہ صبح سنہری دائم ہوگی

اب آخری معرکہ آ پہنچا ہے
سب اپنی جگہ ڈٹ جائیں
بین الاقوامی
نسلِ انساں ہوگی

ظلِ الٰہی کے پرابلمز

پروین شاکر

راج پاٹ کرنے والوں کی جان ہتھیلی پر رہتی ہے
بے چاروں کے مسائل
کیسے عجیب ہوتے ہیں
کبھی اس باجگزار ریاست کی شوریدہ سری
کبھی اس زیرِ نگیں صوبے کی نافرمانی
کبھی خود دار التخت میں غیر مناسب بیداری
کبھی سپہ سالارِ اعظم کا شوقِ لشکر آرائی
کبھی امیر مطبخ کی خاصے میں، خاصی غیر ضروری دلچسپی
شہزادوں کی شورہ پشتی
حرم سرا میں پلنے والی چھوٹی بڑی سیاست
بالاعلان بغاوت، در پردہ سازش
دشمن جلد ہی کھل جاتے ہیں
ان سے نبٹنا اتنا مشکل کام نہیں
الجھاوا تو پاؤں چومنے والوں سے پڑتا ہے
اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں
ایک تو کتّے،
اپنی وفاداری میں شہرۂ عالم رکھنے والے
جب تک جی چاہے پیروں میں لوٹتے ہیں
پھر اپنی اپنی ہڈی لے کر،
الگ ہو جاتے ہیں۔
دوسری قسم زیادہ مہلک ہے
یہ دو پیروں پر چلتی ہے
دیکھنے میں انسان مگر باطن کے ریچھ
تلوے چاٹتے چاٹتے اپنے پیارے آقا کو
ایسا کر دیتے ہیں
کہ ایک سہانی صبح کو جب
اپنی کنیزِ خاص کی بھیرویں سن کر آنکھیں کھولتے ہیں
تو ظلِ الٰہی
اپنے پاؤں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں!

ناظر محمود

ذرائع ابلاغ پر سامراجی غلبہ

آج کی دنیا میں اطلاعات ونشریات کا میدان بھی ایک میدانِ جنگ بن چکا ہے اور ذرائع ابلاغ کی اجارہ داریوں کے خلاف جدوجہد دنیا کی ترقی اور امن کی جدوجہد کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ ذرائع ابلاغ نے سماجی اور معاشی ارتقاء میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

ایک جرمن مفکر نے لکھا ہے "ہزاروں سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے ہیں"۔ اس وقت سے آج تک ذرائع مواصلات اور اطلاعات ونشریات میں متواتر بہتری ہوئی ہے اور آج یہ سماجی زندگی کے سب سے اہم جزو بن چکے ہیں۔

آج کا انسان اطلاعات کی دنیا میں سب سے زیادہ ٹی وی سے متاثر ہوتا ہے۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ ٹی وی کو لوگوں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی شعور میں اضافے کے لیے استعمال کیا جاتا مگر بیشتر ممالک میں ایسا نہیں ہوتا اور ٹی وی کو عوام کی ذہنی پرواز روکنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سوچے سمجھے طریقے پر مقامی فلمی صنعتوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے جس سے تیسری دنیا کے لوگ وی سی آر اور بلو فلموں کی طرف راغب ہوتے ہیں اور سینماؤں میں بھی صرف غیر ملکی اور مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں دیکھ کر ایک طرف بیرونی کمپنیوں کو زرِ مبادلہ فراہم کرتے ہیں، دوسری طرف نوجوانوں کی بڑی تعداد اخلاقی انحطاط پذیری کے ساتھ ساتھ ذہنی سطح پر جیمز بانڈ اور جون ریمبو کے کرداروں میں الجھی رہتی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق سرمایہ دار دنیا کا ہر بچہ ۱۶ سال کی عمر کو پہنچنے تک ٹی وی پر گیارہ ہزار قتل دیکھ چکا ہوتا ہے۔

بین الاقوامی اداروں کے اس رویے کی وجہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ خود اجارہ داریوں سے تعلق رکھتے ہیں اور غلط اطلاعات پہنچا کر دنیا کے عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کرکے اپنے مفادات کا تحفظ حاصل کرتے ہیں۔ ان کی دنیا میں عوام میں اثر کا مطلب ہے۔ ذرائع ابلاغ پر تسلط اور آزادیٔ تحریر کا مطلب ہے گمراہ کن تحریروں کی آزادی اور اپنے سرمائے کے ذریعے رائے عامہ کو تشکیل دینے کی آزادی۔

اطلاعاتی اجارہ داریاں صرف سرمایہ دار ترقی یافتہ ملکوں میں ہی نہیں پائی جاتیں بلکہ چند بین الاقوامی ادارے یا کمپنیاں سارے ترقی پذیر ممالک کے اطلاعاتی اور ثقافتی پروگراموں کو اپنے مفاد میں استعمال کرتی ہیں۔ ان ممالک کو اسّی فیصد.... بین الاقوامی اطلاعات صرف چار بڑی کمپنیوں سے ملتی ہیں۔

سو سے زائد امریکی رسائل غیر ممالک کے لیے خاص ایڈیشن شائع کرتے ہیں۔ ریڈرز ڈائجسٹ کی پندرہ زبانوں میں دو کروڑ اسّی لاکھ سے زائد کاپیاں شائع ہوتی ہیں۔ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون کی کاپیاں سو سے زائد ممالک میں جاتی ہیں۔

نیویارک ٹائمز دنیا کے ۱۳۶ بڑے اخباروں کو مواد مہیا کرتا ہے دنیا بھر کے ممالک کو امریکہ ہر سال دو لاکھ گھنٹوں کے پروگرام مہیا کرتا ہے۔ دوسرے نمبر پر برطانیہ ہے جو تیس ہزار گھنٹوں کے پروگرام دیتا ہے۔ پھر مغربی جرمنی اور فرانس کا نمبر آتا ہے۔ کتابوں میں بھی امریکہ سب سے آگے ہے اور ہر سال تیس کروڑ ڈالر سے زیادہ کی کتابیں برآمد کرتا ہے۔

مواصلاتی آلات کی تیاری پر پندرہ بڑی کمپنیوں کا قبضہ ہے جن میں آئی بی ایم کا پہلا اور جنرل الیکٹرک کا دوسرا نمبر ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہی کمپنیاں۔ پنٹاگون اور دوسرے سامراجی ممالک کی وزارت ہائے دفاع کو آلات مہیا کرتی ہیں۔ اس سارے چکر میں صیہونیت کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ بین الاقوامی ریڈیو اسٹیشنوں۔ اخباروں۔ رسائل اور خبر رساں اداروں کی اکثریت پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ تقریباً سارے امریکی اخبار، رسائل۔ ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن اسرائیل نواز پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ بہت سے دوسرے ملکوں کی اطلاعات پر بااثر حیثیت رکھتے ہیں اور ۷۶ ممالک سے ۱۳۶ اشاعتیں کرتے ہیں جن کی پالیسی جنگجویانہ نسل پرستی کے علاوہ دوسرے ملکوں کے داخلی معاملات میں مداخلت پر مبنی ہوتی ہے۔

چند سال پہلے اقوامِ متحدہ کی تحقیقات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آئی کہ ساری دنیا میں جھوٹی اطلاعات کا ایک منظم جال بچھا ہوا ہے جو دو سو اخبارات۔ تیس خبر رساں اداروں۔ بیس ریڈیو اسٹیشنوں اور پچیس چھاپے خانوں کی مدد سے کام کرتا ہے۔ اطلاعاتی اجارہ داریوں کا واضح مقصد اپنے مفادات کا بیرونِ ملک دفاع کرنا، ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ میں مثبت تبدیلیوں کو روکنا اور عوامی تحریکوں کے خلاف تخریبی کارروائیوں کو ہوا دینا ہے۔

اطلاعاتی اجارہ داریوں کے ذریعے یہ کمپنیاں جو عظیم منافع حاصل کرتی ہیں۔ اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ڈالر کی سرمایہ کاری پر چار ڈالر کا منافع ترقی پذیر ملکوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کا دارومدار مزدوروں کی کم اجرت پر ہوتا ہے۔ کچھ ایشیائی ملکوں میں مزدوروں کی اجرت امریکی مزدور کی اجرت کا دسواں حصہ ہے۔ ترقی پذیر ممالک اپنے خام مال کی اصل قیمت کا صرف دس سے سترہ فیصد حاصل کرتے ہیں باقی مغربی اجارہ داروں کی جیب میں جاتا ہے۔ ان کمپنیوں کی غیر ممالک میں شاخیں ہزاروں ملین ڈالر کی مصنوعات تیار کرتی ہیں اور ان ہی ممالک میں بیچتی ہیں جبکہ منافع انکی تجوریوں میں جاتا ہے۔ چھوٹے ملکوں کی آمدنی قرضوں کی ادائیگی میں چلی جاتی ہے اور قومی بجٹ مسلسل خسارے کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ نتیجہ افراطِ زر، مہنگائی اور غربت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اطلاعاتی اجارہ داریاں دنیا بھر میں ہر وقت ایک تناؤ کی صورت برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جس کی مدد سے تیسری دنیا کی معیشت کو ہتھیاروں کی آگ میں جھونکا جاتا ہے۔ آمروں کو راہ راست پر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور عوام دشمن حکومتوں کی حمایت میں گمراہ کن پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے ٹی وی پروگراموں میں اکثریت مغربی پروگراموں کی ہوتی ہے۔

اطلاعاتی غلبہ کا دائرہ کار بڑھانے کے لیے ہی پچھلے دنوں نام نہاد بین الاقوامی کانفرنسیں بلوائی گئیں۔ جن کے موضوعات تھے۔ آزادانہ انتخابات، خارجہ پالیسی میں نئے رجحانات، جمہوریت کی بحالی وغیرہ۔ گویا دنیا بھر میں جمہوریت کا قتل گوارہ مگر حقیقی جمہوریت نامنظور۔ اطلاعاتی اجارہ داریاں ہمیشہ جمہوریت کے قاتل کو جمہوریت کے محافظ کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ یہ ڈھونگ آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے بھی موجود تھا جب محکوم قوموں سے نام نہاد ہمدردی کا سوانگ رچایا گیا اور دوسری طرف ہٹلر کی پیٹھ تھپکی گئی۔ اس کے بعد ایک طرف برطانیہ کو نوآبادیاں آزاد کرنے کو کہا گیا اور دوسری طرف ہیروشیما اور ناگاساکی کو لاکھوں افراد کا مدفن بنا کر نیا نوآبادیاتی نظام متعارف کرایا گیا۔

اسی اطلاعاتی غلبہ کا سہارا لیتے ہوئے آئزن ہاور نے کوریا میں فوجی مداخلت کو حق بجانب ٹھہرایا اور سایڈن نے نہر سوئز میں۔ یہ اطلاعاتی ایجنسیاں ویت نام میں معصوم لوگوں کے قتلِ عام، گرینیڈا پر فوجی قبضے اور ایران میں شاہ کے ہاتھوں ہزاروں عوام کو ٹینکوں کے نیچے کچلوائے جانے پر کچھ نہیں کہتیں قذافی اور اس کے ملک پر بمباری کروا کر اُسے ہی دہشت گرد مشہور کرتی ہیں۔

اطلاعاتی اجارہ داریاں ۱۹ صدی میں نوآبادیاتی نظام کی پیداوار ہیں جس نے دنیا کو حاکم اور محکوم ملکوں میں تقسیم کیا اور ان کے درمیان ایک خلیج پیدا کی۔ یہ خلیج اطلاعات کے میدان میں بھی سامنے آئی اور سال بہ سال یہ خلیج کم ہونے کی بجائے

سرمایہ دار دنیا کا ہر بچہ ۱۶ سال کی عمر کو پہنچنے تک ٹی وی پر گیارہ ہزار قتل دیکھ چکا ہوتا ہے۔

سامراج کو ایک ڈالر کی سرمایہ کاری پر چار ڈالر کا منافع پسماندہ ممالک سے ملتا ہے۔

وسیع ہوتی گئی۔

۱۹۵۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک رپورٹ پیش کی گئی تھی۔ جس کا نام تھا "دنیا میں اطلاعات کا فقدان" اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت دنیا کے دو ارب لوگوں کے پاس بین الاقوامی اہمیت کی کوئی اطلاع نہیں پہنچ پاتی۔ محققین کے پتا چلایا ہے کہ سو زیادہ ممالک اہم اطلاعات سے محروم رہتے ہیں۔ یہ ممالک اپنے ہر سو باشندوں کے لیے دس اخبارات، پانچ ریڈیو سیٹ، اور دو ٹی وی بھی نہیں رکھتے۔ اس رپورٹ کے پیش ہونے کے ایک سال بعد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنی اقتصادی اور سماجی کونسل کو ہدایت کی کہ ترقی پذیر ملکوں کے لیے نئے بین الاقوامی اطلاعاتی نظام کے قیام کی کوششیں کی جائیں۔ مگر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں پر سرمایہ دار ملکوں کی ثقافتی یلغار بڑھتی ہی گئی۔

آج کی دنیا میں ترقی پذیر ممالک جو دنیا کی آبادی کا ۷۰ فیصد حصہ ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں اخبارات کا صرف چھٹا حصہ شائع کرتے ہیں۔ افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں میں پچاس باشندوں کے لیے ایک اخبار نکلتا ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں ہر تین افراد پر ایک اخبار ہے۔ یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک۔ دنیا بھر کے ٹی وی ٹرانسمیٹر کا صرف پانچ فیصد حصہ رکھتے ہیں اور اٹھارہ فیصد سے بھی کم سینما۔ اب تک تیس ممالک اپنی کوئی خبر رساں ایجنسیز نہیں رکھتے۔ افریقہ میں ہر چار سو آدمیوں پر ایک ٹی وی ہے۔ سارے ترقی پذیر ممالک کے ٹی وی سیٹوں کی مجموعی تعداد امریکہ سے کم ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ان ملکوں کے صرف آٹھ فیصد لوگوں کے پاس ریڈیو تھے اور ترقی یافتہ ممالک میں ستر فیصد سے زیادہ کے پاس۔

ترقی پذیر ممالک کی اکثریت بیرونی ممالک میں اپنا کوئی خبر رساں نمائندہ نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ بڑے ملک جیسے بھارت برازیل اور نائیجیریا وغیرہ بھی صرف چند نمائندے بیرونی ممالک میں رکھتے ہیں۔ گنتی کے ممالک کے علاوہ کسی کے پاس بھی اطلاعات کے جدید آلات نہیں ہیں۔ آج بھی چند خبر رساں ادارے ڈاک کے ذریعے اطلاعات پہنچاتے ہیں۔

اطلاعاتی اجارہ داریاں صرف اپنی مرضی کی خبریں دنیا کو مہیا کرتی ہیں اور عوامی مفاد کی خبریں چھپانے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ اس قسم کی خبروں کو بے تحاشا تشہیر دی جاتی ہے۔ جو لوگوں کی توجہ دنیا کے حالات سے ہٹاتی ہیں مثال کے طور پر چند سال پیشتر شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈائنا کی شادی اور پھر شہزادہ اینڈریو اور سارہ فرگوسن کی شادی نے ساری دنیا کے اخباروں۔ ٹی وی اور خبر رساں اداروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ایک دن سارے لاطینی امریکہ کے اخبارات کا سروے کیا گیا تو پتا چلا کہ اس دن سارے اخباروں کے مطابق تین خبریں سب سے زیادہ اہم تھیں۔ ایک شاہی جوڑے کا ڈنمارک کی پارلیمنٹ کا دورہ، دو افریقی قبائل کا ٹکراؤ اور ترکی میں حضرت نوح کی کشتی کا مبینہ سراغ۔ اسی دن ہونے والے ڈومینکن ریپبلک میں طوفانی واقعات کا کوئی ذکر نہ تھا اور افریقی لیڈروں کی ایک اہم کانفرنس کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔

اطلاعاتی اجارہ داریاں برّاعظموں کی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر نہیں کرتیں بلکہ کیرولین کینیڈی کی تصویروں کی نمائش کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ افریقہ میں رہنے والے لوگوں کو زائر میں ہونے والے خونی واقعات کا علم مغربی.... خبر رسانوں کے ذریعے ہوا کیونکہ ان کے اپنے نمائندے کہیں نہ تھے۔ ان اداروں نے چند یورپیوں کے مرنے کی خبر تو دی مگر اس سے کئی گناہ زیادہ سیاہ فاموں کے مرنے کی خبر نہ دی اور نہ ہی زائر میں بیرونی مداخلت کے بارے میں کچھ بتایا۔

امریکہ میں پچھلے دنوں پچاسی ملین ڈالر کا ایک منصوبہ بنایا گیا جسے "جمہوریت بچاؤ پلان" کا نام دیا گیا ہے۔ جنوبی کوریا میں "روتے وُو" کا چند ماہ پہلے برسر اقتدار آنا شاید اسی جمہوریت بچاؤ پلان کا ایک حصہ ہے۔ ایران میں شاہ کو آخری دم تک برسر اقتدار رکھنے کی کوشش میں جو نقصانات اٹھانے پڑے ان سے بچنے کے لیے فلپائن میں مارکوس اور جنوبی کوریا میں "چن ڈو ہوان" کے سر پر سے ہاتھ اٹھا لیا گیا تاکہ مفادات محفوظ رہیں۔ اس مقصد کے لیے اطلاعاتی اجارہ داریاں راتوں رات "عوامی رہنما" تیار کر سکتی ہیں۔ مسز کورازون اکینو صدر بننے سے کچھ پہلے انتہائی شرمیلی خاتون مانی جاتی تھیں جو صدر بننے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں مگر بے تحاشا تشہیر اور مکمل کوریج نے انہیں پلک جھپکتے لیڈر بنا دیا۔ وقت پڑنے پر پاکستان میں بھی ایک کوئی لیڈر تیار کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور چیز جو عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے وہ ہے کھیلوں کی خبریں۔ کھیل کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر اسے بے انتہا تشہیر دے کر عوام کے ذہنوں کو ماؤف کر دیا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں فٹ بال کے مقابلوں کو اتنی پبلسٹی دی جاتی ہے کہ سارے ریڈیو۔ ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ اور ان سے لوگوں کے ذہنوں پر اتنا مسلط کر دیا جاتا ہے کہ ہار جیت میں مختلف ٹیموں کے حامی ایک دوسرے پر پل پڑتے ہیں اور سینکڑوں افراد ہلاک و زخمی ہو جاتے ہیں۔ کثیر القوامی کمپنیوں کی اسپانسر شپ کی بدولت پاکستان میں "کرکٹ بخار" سے کون واقف نہیں۔ اسے وقتاً فوقتاً وبا کی صورت میں پھیلایا جاتا ہے اور عوام مہنگائی۔ بے روزگاری اور انتخابات وغیرہ سب بھول جاتے ہیں۔

انسانی نقطۂ نظر سے ترقی کا صرف ایک پیمانہ ہے
اور وہ یہ کہ افراد اور طبقات کے درمیان کتنا معاشی
توازن پایا جاتا ہے

LETTERS FROM A DEAD MAN

لیٹرز فرام اے ڈیڈ مین

زاھدہ حنا

ہوا سرد تھی۔ ان کے پیروں کے نیچے نیوکلیائی آگ کی راکھ تھی۔ دنیا کا تمام حسن خاکستر ہو چکا تھا اور اب ان کے بھاری بوٹوں کے تلوں سے، سرمئی راکھ بن کر لپٹ رہا تھا۔

جس زمین پر دریا لہریں لیتے تھے، پیڑ جھومتے تھے بچے قلقاریاں مارتے تھے، نوجوان محبت کرتے تھے، محبوبائیں انتظار کرتی تھیں، بوڑھے کہانیاں سناتے تھے جس کی فضا میں تتلیاں اڑتی تھیں، جس کی ہواؤں میں خوشبو تھی، موسیقی تھی، رعنائی و برنائی تھی۔ وہ زمین اب خاک کا ڈھیر تھی۔

وہ نیلا آسمان جسے کہکشاں اپنا دوشالہ اڑھاتی تھی، چاند کی کشتی جس کی وسعتوں میں تیرتی تھی اور شام کا پہلا تارا جس کی پیشانی پر ہیرے کی طرح جگمگاتا تھا، اس نیلگوں آسمان کو نیوکلیائی آگ کے دھوئیں نے نگل لیا تھا۔

اب محض خنکی تھی، ایک بیکراں اندھیرا تھا اور پاگل کر دینے والا سکوت تھا۔ !

آپ کو اور مجھے اور ہم سب کو وقت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اوپر جو سطریں تحریر ہوئیں، وہ ایک فلم کا منظر نامہ ہیں اور بس۔ حقیقی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس وقت ہماری دنیا ہوسِ جنگ میں مبتلا جن جنونیوں کے چنگل میں ہے، ان سے بعید نہیں کہ کب وہ کسی فلم کے دہشت زدہ کر دینے والے منظر نامے کو حقیقت میں بدل دیں۔

یہ ایک ایسا تھرا دینے والا خیال ہے جو ہم سب کو بہت کچھ سوچنے پر اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بہت کچھ کرنے پر اور مسلسل کرتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ کانسٹنٹائن لپشانکی کا شمار ان ذہین باصلاحیت اور نوجوان فلم ڈائریکٹروں میں ہوتا ہے جو فلم کو انسانی احساسات اور جمالیات کا مؤثر ترین ذریعہ اظہار سمجھتے ہیں۔

کانسٹنٹائن کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور اسی احساس نے ان سے 'لیٹرز فرام اے ڈیڈ مین' ایسی فلم بنوائی ہے جس کا ایک ایک فریم آپ کو اپنی نشست پر منجمد کر دیتا ہے اور آپ کے ذہن میں صرف ایک یہی سوال گردش کرتا ہے کہ ایٹم بم کی شکل میں انسان

نے کہیں اُس جن کو تو بوتل سے آزاد نہیں کر دیا جو آخر کار اپنے آزاد کرنے والے کو سموچا نگل جائے گا اور ہماری دھرتی ریزہ ریزہ ہو کر کائناتی دھول میں بدل جائے گی؟'

کانسٹنٹائن کا کہنا ہے کہ 'جب کوئی مجھ سے یہ سوال کرتا ہے کہ تم نے یہ فلم کیوں بنائی تو میں حیرت زدہ رہ جاتا ہوں۔'

وہ نہیں چاہتا کہ جنگ کا خوف انسانوں کے ذہنوں سے کابوس کی طرح چمٹ جائے اس کا کہنا ہے کہ "میں نہیں چاہتا کہ شدید بارش کے دوران جب بادل کڑکیں تو میرا پانچ سالہ بچہ مجھ سے چمٹ جائے اور پوچھے کہ ڈیڈی کیا جنگ شروع ہو گئی ہے۔؟"

کانسٹنٹائن کو اس عالمی صورتحال سے نفرت ہے جس نے کم عمر بچوں کے ذہن کو بھی جنگ کی ہیبت اور دہشت سے یوں بھر دیا ہے کہ وہ آسمانی بجلی کے کڑکنے کو جنگ کا آغاز تصور کر لیتے ہیں اور بارش سے لطف اندوز ہونے کی بجائے خوف سے لرزنے لگتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں ..... نہیں چاہتا کہ دنیا بھر میں کوئی بھی بڑا کسی بچے سے ایسا سوال سُنے'

اس فلم کے ہیرو رولان بیکو نے اس فلم کے پریمیر کے موقع پر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ انہوں نے اس فلم میں بنیادی کردار کیوں ادا کیا، بے ساختہ کہا' اس فلم میں کام کرنا میرے لیے ناگزیر تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس فلم میں کام کر کے میں نے اپنی شہری اور انسانی ذمہ داری ادا کی ہے'

یہ فلم ایک کمپیوٹر کی غلطی سے شروع ہوتی ہے جو نیوکلیائی حملے کی اطلاع دیتا ہے۔ اس فلم کا مرکزی کردار جو کہ ایک سائنسداں ہے کہتا ہے' میں نے کنٹرول سینٹر کے آپریٹر کو چیختے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا یہ اطلاع سراسر غلط ہے۔ ہم پر نیوکلیائی حملہ نہیں ہوا ہے۔ جوابی کارروائی فوراً روک دو۔ نیوکلیائی میزائلوں کی روانگی منسوخ کر دو۔ منسوخ کر دو' لیکن آپریٹر سے سات سیکنڈ کی تاخیر ہو گئی تھی۔ صرف سات سیکنڈ کی تاخیر۔ اس تاخیر نے ساری دنیا کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا۔ آپریٹر کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انسانیت کے ہاتھ سے سب کچھ نکل چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چودہ منٹ کے اندر اندر ساری دنیا تباہ ہو جائے گی — اور اس 'علم' کا بوجھ اتنا بھیانک اور مہیب تھا کہ اس نے اسی وقت خودکشی کر لی'

یہ فلم ان خطوط پر مشتمل ہے جو لحظہ لحظہ کر کے نیوکلیائی موت مرتے ہوئے ایک باپ نے اپنے مردہ بیٹے کے نام لکھے۔ فلم کے کردار شہر کے آرٹ میوزیم کے تہ خانے میں ہیں کہ ایک کمپیوٹر کی غلط اطلاع سے نیوکلیائی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ تہ خانے سے باہر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور اب تہ خانے کے اندر جو لوگ موجود ہیں، موت ان کا بھی مقدر ہے۔

فلم کا مرکزی کردار ایک سائنسداں ہے جو اس آرٹ میوزیم میں اپنی بیوی، چند ساتھیوں اور بچوں کے ساتھ ہے اور جانتا ہے کہ اسے سسک سسک کر ختم ہو جانا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا بیٹا جو باہر تھا، ختم ہو چکا ہے لیکن وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے بیٹے کے خیال سے گفتگو کرتا رہتا ہے۔ بیٹا جو مستقبل کی علامت ہے، اسے خط لکھتا رہتا ہے۔

'ڈیئر ایرک، قبل اس کے کہ ہم سب — تمہاری ماں، میں اور خود تم کائنات کا حصہ بن جائیں، ہمارے پاس زندہ رہنے کے لیے چند گھنٹے ہیں۔ میں اور تمہاری ماں آرٹ میوزیم کے تہ خانے میں اپنے چند ساتھیوں سمیت پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم یہاں تمہارا انتظار کریں گے۔ شاید تم بچ گئے ہو۔ تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ تم ختم ہو چکے ہو لیکن میں اس بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا'

یہ حتمی موت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر بھی زندگی پر یقین رکھنے کی ایک عظیم کہانی ہے۔ یہ ان بچوں کی کہانی ہے جنہیں فلم کا ہیرو، سائنسداں بستر مرگ پر یقین دلاتا ہے کہ زندگی، موت سے عظیم ہے اور انسان، کائنات میں سانس لینے والا سب سے بہادر اور جی دار ذی حیات ہے۔ یہ ایک مردہ کُرے پر زندگی کے لیے جدوجہد کرنے والے ان بچوں کی کہانی ہے جن سے ایک مرتے ہوئے بہادر انسان نے کہا تھا' ہمت نہ ہارنا، چلتے جانا جب تک کہ تمہارے وجود میں توانائی کا ایک شمہ بھی موجود ہے'

سوویت یونین میں بننے والی یہ فلم دراصل اس عظیم عالمی احساس ذمہ داری کا ایک اظہار ہے جس سے آج ہر باشعور انسان دوچار ہے۔ ہیروشما سے پہلے ہم انسانوں کا خیال تھا کہ افراد کو موت آسکتی ہے، تہذیبیں فنا ہو سکتی ہیں، تاریخ دفن ہو سکتی ہے لیکن انسانیت لازوال ہے، ہماری دھرتی ابدالآباد تک آباد رہنے کے لیے ہے لیکن ہیروشما نے ہم انسانوں کا یہ یقین ہم سے چھین لیا ہے۔ آج ہم سہمے ہوئے بچوں کی طرح ہیں۔ آج ہم جانتے ہیں کہ کسی جنونی حکمران کا ایک اشارہ یا کسی غیر ذمہ دار انسان کی لاپروائی اس کرۂ ارض کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے اور انسانیت ہمیشہ کے لیے معدوم ہو سکتی ہے۔

'لیٹرز فرام اے ڈیڈ مین'، مستقبل کی جانب سے عام انسانوں کے نام ایک کھلا ہوا خط ہے۔ یہ خط ہمیں امن کی طرف بلاتا ہے، یہ ہماری نفرتوں اور ہماری دشمنیوں کی بے حقیقتی ہم پر عیاں کرتا ہے۔ یہ ہمارے ذہنوں میں اس سوال کو اٹھاتا ہے کہ ہم ایک ایسی جنگ کیوں لڑیں جس میں ہر فریق محض ہارنے کے لیے لڑے گا — اور یہ ہار چند انسانوں یا چند قوموں کی نہیں تمام انسانیت کی ہو گی۔

اس فلم میں 'سات سیکنڈ' کو ایک نہایت ہی خوبصورت اور بامعنی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مقدس کتابوں کی رُو سے خدا نے کائنات کو سات دنوں میں پیدا کیا۔ اس فلم میں 'سات سیکنڈ' کی غلطی کائنات کے سب سے حسین اور ذہین کُرے کو نابود کر دیتی ہے۔ شاید کانسٹنٹائن نے 'سات' کا عدد استعمال کر کے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ تخریب کے لیے لمحوں کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ تخلیق اور تعمیر کے لیے خدا کو بھی سات دنوں اور سات راتوں کی مدت درکار ہوئی تھی۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

قرۃ العین حیدر

یاد ایک ایسا پرسکون طوفانی، شفاف اور گدلا سمندر ہے جس کی تہہ میں ان گنت شکستہ جہازوں، جگمگاتے خزانوں اور لاشوں کے شہر خموشاں دفن ہیں۔ ان زیر آب بلوریں محلات میں سمندری پھول تیرتے پھرتے ہیں۔ سبز اور نیلی موجوں کے عکس ان ایوانوں میں لہریں مارتے ہیں اور زمرد کی روشنی میں مونگے کی چٹانوں کے پیچھے چھپی جل پریوں کی آوازیں اس سیال ابدی سناٹے میں مدھم مدھم گونجتی ہیں (یہ آوازیں اگر آپ ساحل پر کوئی سیپی اٹھا کر کان سے لگائیں تو آپ کو سنائی دیں گی) منور۔ نازک سنہری مچھلیاں اور ہیبت ناک شارک چکر کاٹتے ہیں اور وقت کے نئے طوفانوں میں نئے جہاز ڈوب کر اسی تہہ میں جا بیٹھتے ہیں۔ مزید خزانوں کے انبار کا اس زیر آب شہر خموشاں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ تہہ میں پڑی پرانی لاشیں اور گہرائی میں ڈوبتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی شکلیں مدہم ہو جاتی ہیں۔ جواہرات ماند پڑ جاتے ہیں۔ شکستہ جہاز کھیل کھیل ہو کر پانی میں گھل جاتے ہیں اسے "بھول جانا" کہا جاتا ہے۔ ایسا صدیاں گزرنے پر بھی ہوتا ہے اور ایک برس، یا ایک مہینہ گزرنے پر بھی۔ بھول جانے یا یاد رکھنے کی کوئی مقررہ میعاد نہیں۔ انسان ہزاروں اور صدیوں کے پیمانے سے اپنے اجتماعی ماضی کو ماپتا ہے۔ اسکی اپنی عمر اس قدر مختصر ہے کہ وہ اپنے تصور زماں کو اپنے محدود پیمانۂ وقت سے ہی ماپ پاتا ہے اور اسی کو بے چارہ اہم سمجھتا ہے۔ وقت کے محدود تجربے کو جو اسکی تیز رفتار زندگی سے مترادف ہے، وہ تاریخ کی مجموعیت کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور سمندر سنسناتا رہتا ہے۔ اس سے مفر نہیں تاوقتیکہ آپ خود، دوسروں کے لئے ایک یاد بن کر اسی تہہ سے جا لگیں۔

۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم میں کانگریس کے عدم تعاون کے اعلان کے موقع پر یوپی لیجسلیٹو اسمبلی میں اقبال سہیل اعظم گڑھی نے گرج کر برطانوی حکومت کو مخاطب کیا تھا۔

ستم جو ہوگا تو دیکھ لیں گے، کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
بلا سے قزاق آ کے لوٹیں یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے قفس تو کمبخت ٹوٹ جائے

اس وقت سارا ہندوستان ایک عظیم قفس تھا۔ لیکن اس سے چند سال قبل جب ہمارے جہاز ایس ایس مہاراجہ نے کلکتے سے لنگر اٹھایا تھا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ کیسے اور کن متضاد نظریوں کے تحت آزادی کی لڑائی لڑی جا رہی ہے اور ہنسا اور اہنسا کے کیا معنی ہیں۔ والد کے دوستوں میں سے مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا شوکت علی اور حسرت موہانی کے لئے سنا ہے کہ ابھی ابھی برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، ابھی معلوم ہوا کہ جیل چل دیئے۔ یہ اہنسا والے لوگ تھے اور ان ہی دنوں جب یہ خبر آئی کہ "کسی انقلابی نے وائسرائے بہادر پر بم پھینک دیا۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔" تو بہت سے گھروں پر سناٹا چھا جاتا کہ نہ جانے کس ماں کے لال نے پھانسی کی جے مالا پہننے کی سعی کی ہے۔ یہ ہنسا داری یعنی انقلابی دہشت پسند کہلاتے تھے۔

چنانچہ جب روشنیوں سے جگمگاتا جہاز (جس کے عرشے پر گوانی بینڈ "رول برٹینیا" بجا رہا تھا اور اقتصادی کساد بازاری کا غم غلط کرنے کے لئے صاحب اور میم لوگ بار پر بیٹھے بے تحاشا شراب پی رہے تھے کیونکہ بہر حال، سر سراتے پام اور بگوڈا ٹری کے جھرمٹوں میں گھری یہ دمان پرور نو آبادیاں برطانوی امراء کے "چھوٹے بیٹوں" کے ایڈونچر زاور مالی بہبود کے لئے ابھی سالم اور محفوظ تھیں۔ سمرسٹ ماہم اور رالوینن واؤ کے ناولوں کا مشرق تھا۔ لندن کے اخباروں میں بکری ساتھ لئے "ننگے فقیر" گاندھی کی تصاویر شائع ہوتیں جو ایمپائر کی بیخ کنی کے درپے تھا۔ نئی دلی کے وائسریگل لاج کے "مغل باغات" میں لیڈی ولنگڈن سفید سایہ پہن کر والیان ریاست کے ساتھ چائے پیتیں اور کیتھرین میو کا "مدر انڈیا" کب کا چھپ چکا تھا) سبز رنگ کے پانیوں میں داخل ہوا تو اچنبھا مجھے محض اس بات پر ہوا کہ سمندر اتنا وسیع ہے۔ "جنے کتنے مزدور لگے ہوں گے تب جا کر اسے کھودا گیا ہوگا۔ میں نے اظہار خیال کیا اور ریلنگ میں سے سر نکال کر لہروں کو دیکھا کی۔

صاحب لوگوں کے اس جہاز پر ہندی غلاموں میں ہم لوگوں کے علاوہ دوسرا کنبہ مولانا رب نواز کا تھا۔ مولانا رب نواز پورٹ بلیر کے کسی سرکاری محکمے میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پورٹ بلیر کی مسجد کے پیش امام اور واعظ بھی تھے اور رخصت ختم ہونے کے بعد انڈمان واپس جا رہے تھے۔ وہ سنہری کلاہ، اونچے طرے، اور طویل شملے والی ریشمی پگڑی باندھتے تھے اور شلوار پر فراک کوٹ پہن کر اس کے ساتھ ٹائی بھی لگاتے تھے اور فرنچ کٹ داڑھی رکھتے تھے یہ ملکی سیاست کا غالباً بہت ہی نازک دور تھا۔ اکثر وہ زینے پر آ کر اور صاحب لوگ پر دور سے ایک نظر ڈال کر زمیندار اخبار کا پلندہ والدہ کو تھما دیتے اور چپکے چپکے سیاسی تبادلۂ خیالات کرتے رہتے۔ مجھے ان کا حلیہ دھندلا سا یاد ہے مگر یہ سب تفصیلات بڑے ہونے پر والدہ نے بتلائیں۔ والدہ نے بتلایا کہ مولانا رب نواز اس دور کے لاہور کی نفیس تہذیب کے پروردہ تھے۔ عربی و فارسی کے عالم تھے بڑے سچے مسلمان اور بے حد باشعور و حساس انسان تھے اور پیٹ کی خاطر انہیں سرکار کی کلرکی کرنا پڑ رہی تھی۔ مولانا کی بی بی ڈھیلی ڈھالی ریشمی شلوار قمیص میں ملبوس نچلی منزل میں اپنے کیبن میں بند رہتی تھیں۔ مولانا کی بچی فرخندہ جمال میری جتنی رہی ہوگی۔ وہ اکثر کھیلنے کے لئے اوپر عرشے پر آ جاتی۔ اور اس کے جانے کے بعد میں پھر جا کر ریلنگ پر ٹنگ جاتی (جہاز کے بھٹی کی مانند گرم "ہولڈ" میں جیل خانہ تھا)۔

چند روز بعد افق پر جزیرے نمودار ہوئے۔ مونگے کی چٹانیں۔ ناریل کے جھنڈ اور سرسبز، ٹروپیکل پہاڑ۔ پورٹ بلیر کی بندرگاہ قریب آئی۔ بہت سی ڈونگیاں اور موٹر لانچیں جہاز کی سمت بڑھیں۔ بندرگاہ کی عمارت پر یونین جیک لہرا رہا تھا۔ پولیس کے اینگلو انڈین اور کالے سپاہی بندوقیں اٹھائے پہرے پر مستعد تھے۔ سفید سولا ہیٹ پہنے صاحب لوگ رپ رپ کرتا جیٹی پر پھر رہا تھا۔

بینڈ نے "رول برٹینیا" دوبارہ چھیڑا اور جہاز کنارے سے لگ گیا۔ صاحب میم لوگ نیچے اترے۔ مولانا رب نواز کی بی بی بھی سفید شٹل کاک برقعے میں ملفوف، پھلوں کی ٹوکریاں سنبھالے اپنے کیبن سے نکلیں، نیچے جیٹی پر پہنچکر مولانا نے فرخندہ جمال کو کندھے پر بٹھالیا اور بی بی کے آگے آگے چلنے لگے۔ سب سے آخر میں ہولڈ میں سے پابجولاں قیدی نکالے گئے۔ یہ انقلابی نوجوان عمر قید کاٹنے کے لئے ایشیا کے سب سے بڑے قید خانے۔ سیولر جیل لے جائے جارہے تھے۔

ہمارا مکان بارہ بنگلہ ایک سرسبز پہاڑی کے اوپر جھلملا رہا ہے۔ پیچدار سڑک پر سے اس کے پھاٹک تک پہنچنے کے لئے ایک جاپانی وضع کے چوبی پل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مکان اونچے اونچے چوبی کھمبوں پر ایستادہ ہے۔ اس کا نام غالباً "بڑا بنگلہ" کی بگڑی ہوئی بنگالی یا انگریزی شکل ہے! احاطے میں سامنے کی جانب ربڑ کے درختوں کا جھرمٹ ہے۔ بڑے بڑے فرانسیسی دریچوں والے برآمدے سے سمندر نظر آتا ہے جس کی لہریں باغ کی ڈھلوان سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ پرائیوٹ جیٹی پر کھڑی نیلے پردوں والی سفید سرکاری لانچ لہروں پر ڈولا کرتی ہے۔ "بارہ بنگلہ" چوبی عمارت ہے۔ اس لئے نچلی منزل میں جو صرف چوبی کھمبوں کے ایک جنگل پر مشتمل ہے مسلح گارد کے علاوہ چھوٹا سا فائر انجن اور آگ بجھانے والوں کا عملہ بھی مستعد رہتا ہے۔ مکان کے عین عقب میں کاجو کے درختوں سے ڈھکا ہوا اونچا پہاڑ ہے۔

انڈمان کے یہ جزیرے اور پہاڑ دراصل برما کے ارکان یوما پہاڑوں کے زیر سمندر سلسلے کی سات سو میل تک پھیلی چوٹیاں ہیں جو سطح آب سے ابھر آئی ہیں۔ کرۂ ارض کی تشکیل اور طبعی تبدیلیوں کے دوران پہاڑ انڈر گراؤنڈ ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی جوالا مکھی کے بھیانک روپ میں نمودار ہو کر پھٹ پڑتے ہیں۔ جیولوجیکل وقت میں گھری انسان کی زندگی چیونٹی کی عمر سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ دو سو جزیروں کے اس جھرمٹ میں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں۔

ہم ایسے پہاڑوں کی چوٹی پر رہ رہے ہیں جو سالے کے سالے نیلے سمندروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انڈمان ملایائی زبان کے ہندومان کی انگریزی شکل ہے۔ ہندومان ملایائی زبان میں ہنومان جی کو کہتے تھے۔ رامائن کا جنوبی مشرقی ایشیا خصوصاً سیام اور کمبوڈیا وغیرہ کی تہذیب پر صدیوں سے بہت گہرا اثر رہا ہے۔

"ہنومان جی اپنے بندروں سمیت یہاں بھی آن پہنچے تھے؟" بھائی نے گارد کے حولدار رام چندر سے پوچھا۔ جو فیض آباد یعنی اجودھیا کا باشندہ ہے۔

"جی ہاں بابا۔ کون جانے لنکا تک پل بناتے بناتے کودتے پھاندتے یہاں بھی آ گئے ہوں؟ بجرنگ بلی جو ٹھہرے۔ آخر ایک سنجیون بوٹی کی خاطر بھگوان نے سارا پہاڑ ایک ہتھیلی پر اٹھا لیا تھا کہ نہیں؟ ہمیں تو لگتا ہے گئے ہیں آ کر ان جوالا مکھی پہاڑوں کو بھی انہوں نے ہی ساگر میں ڈبو دیا۔" رامچندر نے اپنی لمبی لمبی نوکیلی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر شفقت سے جواب دیا۔ جغرافیہ کی کتاب میں بھائی نے اسی روز پڑھا تھا کہ سفید فام انڈو یورپین آریوں نے جنوب کی سیاہ فام اقوام کو حقارت سے بندر کہا تھا کیونکہ وہ قدیم ترین نیگریٹو نسلیں وادئ سندھ، دکھنی بھارت اور لنکا سے لے کر ملایا اور آسٹریلیا تک بسی تھیں۔ اور جزائر انڈمان اور نکوبار کے یہ "ہنومان" یعنی بندر نما وحشی قبائل اسی قبل از تاریخ نسلی خاندان کے افراد تھے (انتھروپولوجی کے ماہرین کے مطابق انڈمان کے قبیلے دنیا کی اولین نسل انسانی کے آخری بچے کھچے افراد تھے)۔ مگر حوالدار رامچندر کی وہ ہنومان جی والی بات زیادہ میرے جی کو لگی۔

کورومنڈل، بنگال، مالابار، سوراشٹر، سندھ اور لنکا کی بندرگاہوں نے حضرت سلیمانؑ کی سلطنت اور بحیرۂ روم کے ممالک اور بابل و نینوا سے تجارت کی تھی۔ فراعنہ مصر کی ممیاں ہند کی ململ اور سوتی چھینٹوں میں لپیٹی جاتی تھیں اور پوپ گریگری اعظم کے ترجمے کئے ہوئے لاطینی عہد نامہ قدیم میں حضرت ایوبؑ نے فرمایا تھا۔ "میری عقل و فراست کو ہند کے رنگین کپڑوں سے تشبیہ مت دو۔" گپتا تمدن سارے جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلا تھا اور قرون وسطی میں عرب تاجر اور چاٹگام کے ملاح دنیا کے سمندروں پر اپنے پھریرے اڑاتے پھرتے تھے۔ مگر جب مشرق کا زوال شروع ہوا اور دنیا کے بازاروں میں ہند کی تجارتی قیادت اور صنعتی دھاک ختم ہو چلی تب بھی حیدر علی اور ٹیپو سے قبل، دلی کے مغلوں اور بنگال کے نوابوں کو یہ خیال نہ آیا کہ بحری طاقت بھی کوئی شے ہے۔ بے چارے حیدر علی نے نیوی بنائی اور ٹیپو نے مالدیپ پر اپنے بحریے کے ہیڈ کوارٹرز قائم کئے مگر اس وقت پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ فرض کیجئے سارے جزیرے نما کی حفاظت کے لئے نیوی موجود ہوتی تو سولہویں صدی میں یوروپین طاقتیں اس آسانی سے ملک میں نہ گھس آتیں۔ اب مثال کے طور پر ہندومانی دیپ ہی کو لیجئے، اگر مغل گورنمنٹ نے یا مانڈلے بادشاہوں نے یہاں ایک بحری چوکی قائم کر دی ہوتی تو جو پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی یا برطانوی جہاز ادھر سے گزرتا اس میں بھوسہ بھر دیتے۔

چنانچہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک نقشہ نویس آرچی بالڈ بلیر نے ایک ایک ٹاپو کی پیمائش کر کے یہاں ۱۷۸۸ء میں نو آبادی قائم کی، ان زرخیز ٹاپوؤں پر قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں نے اپنی جان لڑا دی کیونکہ ہندومانی قبائل نے اپنے زہر میں بجھے تیروں اور بھالوں کے ذریعے صاحب لوگوں کی ایسی تواضع کی تھی کہ امریکہ کے ریڈ انڈین، افریقہ کے حبشی اور آسٹریلیا کے بش مین نے صاحبان عالی شان کا ایسا بھرکس نہ نکالا ہوگا۔ لیکن انگریز کا اقبال کیا شے ہے۔ صاحب جہاں پہنچتا ہے وہاں گلزار کھلا دیتا ہے۔ اب ان جزیروں پر خالص ولایتی ناموں والے بارونق اور خوبصورت شہر آباد ہیں۔ پورٹ کارنوالیس۔ ایلفنسٹن ہاربر۔

پورٹ بلیر میں اسکول نہیں تھے۔ لہذا ایک برمی نوجوان بھائی کو پڑھانے کے لئے آیا کرتا۔ اور خوابناک آنکھوں سے سمندر کو تکتے ہوئے کبھی کبھی برما کی عظمت کے قصے سناتا۔ "جانتے ہو بنگال اور مشرقی ہند کے نو آباد کار زیادہ تر اسکاٹش کیوں ہیں؟ اس لئے کہ اسکاٹ لینڈ کے اجاڑ پہاڑوں پر بھوکے مرتے تھے۔" وہ بڑا جوشیلا برمی تھا۔ "ہر چیز کی ایک اقتصادی وجہ ہے۔ کاز اینڈ ایفکٹ۔" وہ ہوا میں انگلیاں گھما کر بتاتا۔ دس گیارہ سالہ بھائی کی سمجھ میں اتنی بڑی باتیں نہ آتیں تو وہ اکتا کر چپ ہو جاتا اور سمندر کو تکنے لگتا۔ یا پھر اراکانی قزاقوں کے قصے سناتا۔ جنہوں نے دو سو سال قبل یہاں اڈے بنا لئے تھے اور مشرقی بنگال کی دریائی تجارت پر حملے کیا کرتے تھے۔ "لیکن یہ پورٹ کیمپ بل جن بزرگ کے نام پر بسایا گیا ہے ان سے بڑا بحری قزاق سارا دنیا میں نہ ہوگا۔ انہوں نے تو سارے برما ہی پر قبضہ کر لیا۔ یہ سب" وہ باہیں پھیلا کر اور بجو کی طرح آنکھیں گول گول کر کے کہتا۔ "یہ سارا ایشیا ایک سیلیو مارکیٹ ہے۔ تم ہندوستانی مہنگے سیلیو ہو۔ ہم تم سے زیادہ سستے سیلیو ہیں۔ بائی بائی۔" اور کرسی سے اچھل کر تیزی کے ساتھ زینے سے نیچے اتر جاتا۔

یہ جزیرے۔ گوگاں اگر یہاں آتا تو تاہٹی کو بھول جاتا۔ اہل ہند کے لئے "کالا پانی" ہیں۔ غدر کے باغیوں کو کالے پانی کی سزا دینے کے بعد سے جزائر کو چیف کمشنر کا صوبہ بنایا جا چکا ہے۔ ۱۸۷۲ء میں لارڈ میو وائسرائے ہند سیلولر جیل (جو عام طور سے سلور جیل کہلاتا ہے) کا معائنہ کرتے ہوئے ایک قیدی کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس صدی کے شروع سے ملک میں انقلابی تحریک چل رہی ہے اور دہشت پسندوں کو بغیر ٹرائل کے کالے پانی بھیجا جا رہا ہے۔

یہ مرجانی جزیرے سونا اگلتے ہیں۔ گھنے جنگلوں کی قیمتی لکڑی یوروپ اور امریکہ ایکسپورٹ کی جاتی ہے۔ کافی چائے اور منیلا کے سن کی کاشت کے لئے ایشیا کے سب سے بڑے جیل کے ہزاروں قیدیوں کی بیگار موجود ہے۔

سامنے شیشوں والے برآمدے کے کونے میں پرانی وضع (اس وقت وہ نئی وضع تھی) کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے تو میں اسٹول پر چڑھ کر اس تک پہنچتی ہوں۔ "ہلو۔ ہلو۔ جی ہاں ہم بارہ بنگلہ سے بول رہے ہیں۔"

ہم سب، ساری دنیا، ساری اقوام، نسلیں، مذاہب، فرقے، طبقے، ممالک، خیالات، نظریے، تعصبات، فلسفے، ادبیات، علوم و فنون، ہماری مختلف الہیات۔ روحانی اور جذباتی تجربات، سیاسی سماجی، تمدنی مسائل، ہماری اجتماعی اور انفرادی شخصیت، ہماری خامیاں اور ہماری خوبیاں، دشمنی اور دوستی، فتح و شکست، کمال اور زوال، دکھ اور سکھ، حسب و نسب، تاریخ کی وجوہ کے گنجلک، دھندلے روشن، واضح تفاعل کی پیداوار ہیں۔

رات بھر باغ کی کول تار کی سڑک پر گارد کے قدموں کی کھٹ کھٹ گونجتی ہے۔ لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ۔ ہالٹ حکم صدر... کھٹ کھٹ۔ کھٹ۔ صبح سویرے سر پر سفید رومال باندھے۔ برتی مہتر پہلو کے چوبی زینے پر نمودار ہوتا ہے اور نیچے بھگوتی جیون مالی کھرپا سنبھالے انگوچھا سر پہ لپیٹا باغ میں پہنچ جاتا ہے۔ بھگوتی مشرقی یوپی سے برآمد شدہ INDENTURED LABOUR سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا سارا کنبہ دو پیڑھیوں سے کافی کے باغات میں کام کر رہا ہے۔ برطانوی پلانٹر جن کے مالک ہیں۔ لارڈ کارنوالس کے نافذ کئے ہوئے استمراری بندوبست کی بدولت جب یوپی میں بھیانک قحط پڑا تو آج سے ایک صدی قبل ہزارہا فاقہ زدہ کسانوں کو جہازوں میں بھر بھر کر نیم غلاموں کی حیثیت سے آسام، افریقہ، جزائر غرب الہند، فی جی اور ماریشس میں اہل برطانیہ کے پلانٹیشنز پر مزدوری کرنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ ان کی اولاد آج تک وہاں اسی حالت میں موجود ہے۔ بھگوتی انہی لوگوں کا بھائی بند ہے۔

جب سورج نکل آتا ہے تو پینٹری میں سے نور محمد بیرے کی چھینک اور گرجدار الحمد اللہ کی آواز آتی ہے۔ نور محمد ضلع جھنگ کا باشندہ ہے اور اپنی بیوی اور اس کے عاشق کو کلہاڑے سے قتل کر کے یہاں تشریف لایا ہے۔ بوڑھا نور محمد ایک نیک دل اور دیندار انسان ہے۔ ہر بات کے جواب میں "ہوں جناب" کہتا ہے جو "بہت اچھا جناب" کا مخفف ہے۔ نوجوان کلینر اور بوڑھا خانساماں دونوں قاتل ہیں۔ یہ تینوں اچھے اور آزاد قیدیوں میں شامل ہیں۔ ان کی مانند باقی سرکاری مکانوں پر جو ملازم برسوں سے کام کر رہے ہیں انہوں نے زیادہ تر پنجاب کے کھیتوں میں آب رسانی کے جھگڑوں، آبائی عناد اور معاملات حسن و عشق کے سلسلے میں خون خرابہ کیا تھا۔ یہ سب سیدھے سادے جوان، ادھیڑ، بوڑھے، ہندو مسلمان سکھ "ہندوستانی" پنجابی اور دوسرے صوبوں کے لوگ ہیں ؎

تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

کتے کا نام ایک مسئلہ ہے۔ یہ بے حد محبت شعار السیشن ہمیں پچھلے انگریز افسر سے ترکے میں ملا ہے اس کا نام "ٹیپو تھا"۔ "ہم اسے آرتھر پکاریں گے۔" والد نے فیصلہ کیا۔ مگر وہ آرتھر کے نام پر بیوقوفوں کی طرح چپ بیٹھا دم ہلاتا رہا کہ ٹیپو کہلانے کی اسکی عادت راسخ ہو چکی تھی۔ چونکہ سب کو منع کر دیا تھا کہ اسے ٹیپو نہ پکارا جائے اس لئے اب وہ گمنام ہی ادھر ادھر پھرتا اور متعجب اور پرامید نظروں سے سب کی شکلوں کو تکتا۔

پرکاش چند کلینر پابندی سے شام کے وقت آرتھر کو ساحل پر ٹہلانے لے جاتا ہے اور سر جھکا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جانے کیا سوچتا رہتا ہے۔ اس نے جے پور میں اپنی محبوبہ کے قاتل کو مار ڈالا تھا۔ پرکاش چند تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ اکثر وہ پنڈت رام پرشاد بسمل شاہجہانپوری کا مشہور شعر زیر لب پڑھتا ہے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

"بھگت سنگھ اور رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ اور چندر شیکھر آزاد اور ان گنت نوجوان تختۂ دار پر چڑھ چکے ہیں۔ اس وقت سارا ہندوستان بسمل کے اس شعر سے گونج رہا ہے اور میں یہاں ذلت کی موت مروں گا۔" وہ سر اٹھا کر بھائی سے کہتا ہے۔ پھر کوئی سیپی اٹھا کر کان سے لگا لیتا ہے اور سمندر کی آواز سنتا رہتا ہے۔ میں ادھر ادھر ریت پر ماری ماری پھر رہی ہوں اور خوبصورت بڑی بڑی کوڑیاں سیپیاں اور گھونگھے جمع کرتی جا رہی ہوں۔ تب پرکاش چند ایک سیپی دور پانی میں پھینک کر اچانک بھائی سے کہتا ہے۔ "بابا۔ آپ کو معلوم ہے جب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر رام نرائن موزوں نے سنی تو انہوں نے کیا کیا۔؟ وہ ایک راجہ تھے پٹنے کے۔ اور شاعر تھے۔ یہ خبر سن کر جس کے بعد سے ہندوستان کی دیا ولی بجھ گئی، انہوں نے کہا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر، ویرانے پر کیا گزری

اور کپڑے پھاڑ کر سر پہ خاک ڈالتے گھر سے نکل گئے۔ اُدہر۔" وہ افق کی سمت باہیں پھیلا کر کہتا ہے۔" ادہر، اس ویرانے پر، تب سے لکر آج تک کیا گزری ہے اور اس وقت بھی کیا گزری ہے ۔؟" اور پھر آرتھر ویلز کو بلا کر چپ چپ اسکی ٹہل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اب سورج سمندر میں ڈوب چکا ہے اور بارہ بنگلہ پر روشنیاں جل اٹھی ہیں۔ شفق کی سرخی ریت پر لہریں مار رہی ہے اور بھائی سر جھکائے اِکا دکا سیپیاں اور کوڑیاں چنتے، لان کی سیڑھیاں چڑھ کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

" ڈیر جلیل! یہ آپ سن ہی چکے ہوں گے کہ میں نے پھر ہندوستان چھوڑ دیا۔ دو برس کے لئے جلا وطنی اختیار کرلی ہے۔ یہاں فرصت ہے اور تنہائی ؎

قید خود اختیاری

ہوں مبارک دوستو دنیا کی تم کو وسعتیں!
میری قسمت میں فقط اک تنگ زنداں رہ گیا
ہم کو کیا اہلِ خرد ہوں محو گل گشتِ چمن!
چل دیئے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا

انڈمان کا جزیرہ بہت بدنام ہے۔ مگر یہاں عیش بھی ہے۔ کالے آدمیوں کے لئے نہیں جن کی قسمت میں محنت و مشقت کے سوا کچھ نہیں بلکہ انگریزوں کے لئے ان کی الگ آبادی ہے۔ بنگلے ہیں سبزہ ہے۔ کلب ہے جس میں میمیں اور انگریز ہر طرف نظر آتے ہیں مگر ہندوستانی شاذ و نادر ہیں۔ میں بھی شامل کر لیا گیا ہوں۔ مگر نہ چونکہ ناچنا آتا ہے نہ پینا۔ اُلو کی طرح بیٹھا رہتا ہوں ؎

وہ کسی کے واسطے تو ہو گیا عشرت کدہ
انڈمن کیوں ہند کا منحوس زنداں ہو گیا

آپ لوگوں کی یاد اور تذکرہ ہر وقت رہتا ہے ؎

سیدینؔ و سرورؔ و قدوائیؔ کا ذکرِ خیال
درد بھی یہ ہو گیا اور یہ ہی درد ماں ہو گیا

خاکسار۔ سجادؔ[1]

میں اور بھائی ساحل سے واپس آچکے ہیں۔ آرتھر برآمدے کے فرش پر لیٹا قناعت سے ستا رہا ہے۔ دور دور سے جزیرے پر جھلملاتے کلب کی روشنیاں دریچے میں سے نظر آرہی ہیں۔ حوالدار رامچندر، ہمارے والدین اور مدراسی ہمسائے مسٹر و مسز کیسو در کو لانچ پر پہنچا کر اندھیرے میں اپنی لالٹین چمکاتا ساحل سے واپس آرہا ہے۔ تاریکی گہری ہو چکی ہے اور چاروں کھونٹ سمندر کی سنسناہٹ خوفناک ہے۔

رامچندر کے قدموں کی چاپ زینے پر سنائی دیتی ہے۔ بھائی برآمدے کے ایک سرے پر ٹیبل لیمپ کے نیچے بیٹھے برمی ٹیچر کو سنانے کے لئے سبق یاد کر رہے ہیں۔ جو کل صبح سویرے پھر آجائیگا۔ روشن لانچ فراٹے بھرتی سمندر کی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔ رامچندر مونچھوں کے اندر مسکراتا برآمدے میں داخل ہوتا ہے اور بھائی کے پاس جا کر بڑی اداکاری سے کہتا ہے" بابا۔ کل آپ لوگ ایک تماسا دیکھنے گا۔ مل ڈریئے گا نہیں۔"

"کیا ہے ۔؟" بھائی موٹی ٹیچر وری تیز پر پیچ کر خوشی سے پوچھتے ہیں۔

"کیا تماشا ہے رامچندر؟ جلدی بتاؤ۔" میں جواب تک کرسی پر کھڑی ہو کر دریچے سے باہر لانچ کو دیکھ رہی تھی فوراً چلاتی ہوں۔

"ابھی نہیں۔ بیٹیا۔ کل سببیرے۔" اتنا کہہ کر حوالدار رامچندر دوسرے زینے سے نیچے اترتا ہے۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ دور پھاٹک پر ٹہلتے پہرے دار کی آواز بلند ہوتی ہے۔" ہالٹ!"

وہ ایک قبائلی وحشی بچہ تھا۔ نہ معلوم کس طرح بھٹک کر آبادی میں آنکلا اور بارہ بنگلہ کی عقبی پہاڑی پر کاجو کے جنگل میں چھپ رہا تھا۔ نور محمد تڑکے گجردم پہاڑی کی ایک چٹان پر جا کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ سلام پھیرنے کے بعد ان کی نظر اس بچے پر پڑ گئی جو پتوں کی جھالریں پہنے، چند جنگلی جڑیں کھا کر اپنا پیٹ بھر رہا تھا۔ نور محمد کی آدھی زندگی پورٹ بلیئر میں گزر گئی تھی مگر انہوں نے اصل نسل وحشی پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے پکڑنے کو دوڑے مگر بوڑھے آدمی تھے اس لئے تعاقب نہ کر سکے اور وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ لیکن شام پڑے تک اسے رامچندر نے ربڑ کے جھرمٹ میں سے ڈھونڈھ نکالا جہاں وہ ایک درخت سے چمٹا سہما ہوا بیٹھا تھا۔

صبح کو والد کے دفتر چلے جانے کے بعد رامچندر وعدے کے مطابق ہمیں تماشا دکھانے کے لئے اسے گھسیٹتے ہوئے لے کر اوپر آئے اور برآمدے کے فرش پر اسے اس طرح چھوڑا جیسے بلی کے بچے یا پلّے کو بوری میں سے نکال کر زمین پر رکھ دیتے ہیں۔

وہ ایک نو دس سالہ لڑکا تھا لیکن بے حد پستہ قد ہونے کی وجہ سے چار پانچ سال سے زیادہ کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ ساحلی چٹانوں کے راستے سے باسانی اپنے جنگل کو واپس جا سکتا تھا مگر شاید وہ کوشش کر کے شہر آیا تھا۔ مہذب انسانوں سے خائف بھی تھا اور غالباً ان کے ساتھ رہنا بھی چاہتا تھا لیکن اپنی خواہش کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔ بارہ بنگلے کا سارا عملہ اس کے چاروں طرف جمع ہو گیا۔ کرۂ ارض کی اولین نسل انسانی کا یہ نمائندہ، ارتقا کی پہلی سیڑھی پر پہنچکر پچھلے ہزاروں برس سے اسی سیڑھی پر ٹھٹھکا ہوا ابن آدم، ارد گرد جمع اپنے ترقی یافتہ رشتے داروں کو خوفزدہ وحشی جانور کی طرح تکتا رہا۔

"ہا۔ نگوڑا ابن مانس کیسے ٹکر ٹکر سب جنوں کا تکتا ہے۔" صدیق چپڑاسی کی بی بی مشتاقن نے، جو گھونگٹ کاڑھ کر کا نا پردہ کرتی تھیں۔ بڑی ممتا سے کہا۔" تم ہی کا دیکھتا ہے ٹکر ٹکر۔!" بھگوتی مالی نے کہا۔

"اپنی موسی کا پہچان لیہس ہے بھر جائی۔!" رام چندر کہ بہت پر مذاق تھے۔ مشتاقن سے بولے۔ مشتاقن پیٹ بھرکے کالی تھیں۔ "کالا منہ نیلے ہاتھ پاؤں۔" مشتاقن نے مصنوعی غصے سے کہا۔ اتنے میں بھگوتی مالی کی بی بی گلبیا اور عزیزن آیا بھی آن پہنچیں۔" ارے باپ رے۔ ای تو بہوتے بھیانک ہے۔ جیس تیلی مسان۔ بدا رواح۔ توبہ توبہ" عزیزن نے دہل کر کہا۔" اِدھر سمندر میں بہت جل مانس رہت ہیں۔" رام چندر نے مسکرا کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔" نا بھیا! ہم کا نا ڈراؤ۔ ہم رات برات باہر نکلت ہیں۔" عزیزن نے ہاتھ جوڑے۔

"جل مانس ہوں کہ بج گینڈے۔ ہم کسی سے نہیں ڈرت ہیں۔ آہ۔ پچ پچ۔ پچ۔" مشتاقن نے پیار سے چٹکی بجا کر بچے کو اپنی طرف بلانا چاہا۔ اتنے میں نور محمد باقاعدہ کھانے کی ٹرے لے کر آگئے اور پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ بچے نے جھڑے بال جھٹک کر چاروں طرف دیکھا۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے پلیٹ کی سمت چلا اور کھانے کو غور سے دیکھنے لگا۔" ہا۔ دُکھیا چنڈال بن میں سانپ چھپکلی کھا کھا کر جیت ہیں۔" بی مشتاقن بولیں اور اس کے لئے نوالے بنانے کے ارادے سے اکڑوں بیٹھی ہی تھیں کہ اس نے گوریلا کے تھپیڑ کی طرح زور سے انہیں ایک ہاتھ رسید کیا۔ مشتاقن زوردار چیخ مار کر وہاں سے بھاگیں، افراتفری مچ گئی۔ والدہ صبح سے مسز کیسو ورکے گھر گئی ہوئی تھیں۔ عزیزن انہیں بلانے کے لئے دوڑیں۔ رامچندر بچے کو اچھی طرح پکڑ کر بیٹھ گئے اور اسے کھلانے کی کوشش کرنے لگے۔" جناب۔ اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان کرلیں؟" نور محمد نے چپکے سے صدیق سے تجویز کیا۔

"گورنمنٹ نہیں ہے۔" صدیق نے اسی سرگوشی میں جواب دیا۔

"کیا۔؟"

"جنگلی والا کو جنگلی والا ہی رہنا مانگتا۔" برمی جہتر نے نور محمد کو سمجھایا۔

"واہ اور مشنری لوگ کو آرڈر ہے کہ بنائے جاؤ سب کو کرسٹان۔ ابھی جا کر اسے چپکے سے مولانا صاحب کو دے آتے ہیں۔"

"نور محمد۔" سلامت خان ہیڈ کانسٹبل نے قریب آکر ڈنڈا بجاتے ہوئے ذرا ڈپٹ کر کہا۔" جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔"

"ہوں جناب۔" نور محمد نے جھاڑن کندھے پر ڈالا اور سر جھکائے پینٹری کی طرف چلے گئے۔

"ہم بابا لوگ کو تماسا دکھائے کھاتر ای کا اوپر لائے رہے۔ تماسا کھتم۔ پیسہ ہجم۔ چلئے خان صاحب۔ ای کا جنگل ما واپس بٹھائے دیں۔"

بچہ سرکاری قانون کے مطابق واپس لے جا کر جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔

"اس پر مضمون لکھو مسٹر۔!" دوسرے روز برمی ٹیوٹر بھائی سے کہتا ہے۔ ("ایک انڈمانی لڑکا" اور پورٹ بلیر کے شب و روز کے متعلق ہوم ورک کے طور پر لکھے ہوئے بھائی کے " ESSAYS " کی اس شکستہ اور پیلی کاپی بک کی مدد سے اس وقت میں یہ کہانی لکھ رہی ہوں)۔

جزائر کے گھنے اور ناقابل عبور جنگلوں میں قدیم آبادی صرف چند ہزار رہ گئی تھی۔ متعدی بیماریاں جو نوآبادکار اپنے ساتھ لائے تھے اور انتھروپولوجی کی اصطلاح میں "متمدن دنیا سے تعارف" کی وجہ سے قدیم حجری عہد کے یہ قبائل تیزی سے مر رہے تھے۔ تاریک جنگلوں میں جن کے اندر سانپ اور بھیانک مگرمچھ ایسی چھپکلیاں سرسراتی تھیں۔ یہ بے چارے وحشی تیر کمان سے شکار کھیلتے پھرتے، ان کی بولیوں کا کسی لسانی گروہ سے تعلق نہیں تھا۔ اکثر قبائل کے یہاں بول چال ہی کا ارتقا نہیں ہوا تھا۔ اور آگ کے استعمال سے وہ نا واقف تھے۔

اکا دکا سیاسی قیدی درختوں کے کھوکھلے تنوں کی ناؤ بنا کر فرار کی کوشش کرتے مگر حکومت نے نسبتاً ترقی یافتہ قبائل کو ان کے تعاقب کے لئے مقرر کر رکھا تھا، اور زہر آلود تیروں کی زد سے بچ نکلنا مفرور قیدیوں کے لئے ناممکن تھا۔ غالباً ایسی ہی صورتحال کے لئے میرابائی کہہ گئیں تھیں۔" کوس کوس پر پہرہ بیٹھا۔ پینڈ پینڈ بٹ مار۔")

اکثر شام پڑے ہم لوگ ہوا خوری کے لئے شہر کے قریبی جنگلوں کی طرف نکل جاتے۔ پورٹ بلیر اور اس کے پڑوسی شہر ایبرڈین کی روشنیاں اندھیرے میں غائب ہو جاتیں اور کسی گھاٹی میں سے گزرتے ہوئے ہمیں دفعتاً ناریل کی فرمائش کرتی۔ سڑک پر جاتا ہوا تھوسے کے پلانٹیشنز کا کوئی مزدور ناریل کے درخت پر چڑھتا اور ناریل توڑ کر بندر کی سی پھرتی سے نیچے اتر آتا۔ کافی کے باغات سے نکل کر ہم جنگلوں کی طرف رواں رہتے۔ دور کہیں آگ جلتی نظر آتی۔ سمندری ہوا ساحلی چٹانوں میں سائیں سائیں کرتی۔ راستے میں چاند ملتا۔

"چاند ہمارے ساتھ ساتھ کیوں چل رہا ہے؟" میں تعجب سے پوچھتی۔ "آپ کو سلام کرتا ہوا جا رہا ہے۔" والد جواب دیتے۔ ساگر جزیرے پر، تاڑ کے سیاہ درختوں پر، ہری بھری پہاڑیوں پر تیز چاندنی پھیل جاتی۔ بانس کے جھرمٹ ہوا میں سرسراتے۔ ہوائیں بھی میری دوست ہیں۔

کبھی کبھی اتوار کے روز شہر سے مولانا رب نواز مع فرخندہ اور شٹل کاک برقعے میں ملفوف اپنی بیوی کے ہمارے یہاں آتے اور جنگلیوں والے برآمدے میں بیٹھ کر والد سے باتیں کیا کرتے۔ کلام اقبال پڑھتے جاتے اور پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھتے۔ جمعے کے روز مسجد میں مولانا کے وعظ مسلمان قیدیوں میں اس قدر مقبول ہو چکے تھے کہ انگریزوں کو مولانا کی طرف سے فکر ہو گئی تھی۔

ایک روز روس آئی لینڈ ROSS ISLAND پر حوالدار رامچندر کے ساتھ چیف کمشنر کے باغ میں سے گزرتے ہوئے اس کے بنگلے کے دریچے سے مجھے دو فل بوٹ نظر آئے جو مگدر جیسے چوبی فرموں پر چڑھے ہوئے تھے۔" یہ مسٹر اینڈرسن کی ٹانگیں ہیں جنہیں گھر پر چھوڑ کر وہ خود باہر چلے جاتے ہیں۔" میں نے سوچا اور بے حد ڈری۔

بھائی کی کاپی بک میں لکھا ہوا ایک قدیم "نرسری گیت"۔

HOW MANY MILES TO BABYLON?
THREE SCORES AND TEN
CAN I GET THERE BY CANDLE_LIGHT
YES,AND BACK AGAIN
IF YOUR HEELS ARE NIMBLE AND LIGHT
YOU CAN GET THERE BY CANDLE_LIGHT.

اچانک بڑی گہما گہمی سی شروع ہو گئی۔ سلور جیل کے چند بنگالی انقلابیوں نے جیل کے حکام کی شدید بدسلوکیوں کے خلاف احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی۔ ان سیاسی اسیروں میں قید تنہائی کاٹنے والے بھی شامل تھے۔ ان میں سے کچھ نوجوانوں نے دم توڑ دیا۔ شام کو میں نے دیکھا کہ مسٹر اینڈرسن فل بوٹ

---

[1] جلیل قدوائی کے نام والد مرحوم کے ایک خط سے اقتباس۔

پہنے کار میں سوار ہو رہے ہیں جو جاپانی پل کے نیچے کھڑی تھی۔ والد کا تعلق جزائر کے محکمہ مالیات سے تھا۔ پینل سیٹلمنٹ کا انتظام علیحدہ اور صرف انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود جزیرے میں ممکنہ بغاوت کے خدشے سے بارہ جنگلہ کی گارد دوہری کر دی گئی۔

دوسرے روز ایک سیاسی قیدی اسٹریچر پر پڑا ہوا نیچے گھاٹی کی سڑک پر سے گزرا۔ "سدھیر کمار بوس یہی ہے۔" پرکاش چند کلینر نے آہستہ سے بری یوٹی کو بتلایا۔ وہ دونوں بھائی کے ساتھ پہلو کے برآمدے کے جنگلے پر جھکے ہوئے تھے۔ میں جنگلے کی جالی میں سے نیچے جھانک رہی تھی۔ "سنا ہے کل بڑا صاحب خود اس کی کوٹھری میں گیا تھا۔ جو تالات سے بات کرنے۔ اتنا تو یہ کمزور ہے۔ پینکیا پہلوان۔ مگر کھاٹ سے اٹھ کر پل پڑا بڑے صاحب پر۔ صاحب بھاگا باہر سرپٹ۔ اور پولیس کو آرڈر دیا کہ اسے خوب پیٹو۔"

"مسٹر اینڈرسن اپنی ٹانگیں ساتھ لے گئے تھے۔ تبھی تو بھاگے سرپٹ۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اب شاید ٹھکائی کر کے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ سول سرجن والے ہسپتال۔ مگر مر جائیگا۔" نور محمد نے آہستہ سے کہا۔ آنکھیں پونچھیں سفید بگلا داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ اور پلٹ کر آواز دی۔ "آجاؤ بیٹو۔ نہیں۔ توبہ۔ آرتھر۔ آرتھر۔ چلو رات کا ٹیم ہوگیا۔" اندر چلے گئے۔

ایک روز ایام جاہلیت کا افسوسناک خاتمہ ہوگیا۔ والد برآمدے میں بیٹھے ہندوستان سے آئی ہوئی تازہ ڈاک دیکھ رہے تھے، میں فرش پر بیٹھی جہازی سائز کے نئے ادبی دنیا اور نیرنگ خیال کے ورق الٹنے پلٹنے میں مصروف تھی کہ غالباً نیرنگ خیال میں ایک الف لیلوی سے بازار کی رنگین تصویر نظر پڑی جس میں قالین بچھے تھے اور ایک حسین کنیز فروخت کی جا رہی تھی۔ تصویر کے نیچے جلی حروف میں ایک مصرعہ لکھا تھا۔[1] میں نے تصویر والد کو دکھا کر ان سے پوچھا "یہ کیا لکھا ہے۔؟" انہوں نے چونک کر ذرا رنج کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا "افسوس کہ یہاں آپ بالکل جاہل رہ جائیں گی۔ اب آپ کو پڑھنا شروع کر دینا چاہیئے۔"

چنانچہ دوسرے دن مولانا رب نواز کو بلایا گیا۔ جب وہ برآمدے میں آن کر بیٹھے تو نور محمد نے فرط عقیدت سے ان کے ہاتھ چومے اور اپنی آنکھوں سے لگائے اور جلدی سے چاء اور مٹھائی لا کر ان کے سامنے رکھی۔

"کوئی چار سال چار ماہ چار دن کی ہوگئی ہے؟" انہوں نے دریافت کیا اور مطلع کیا کہ جمعے کے روز قاعدہ لے کر آئیں گے۔

اب میں بے وقوفی میں یہ سمجھی کہ قاعدہ گڑیا کا گھر ہوگا۔ یہ بیوقوفی کی انتہا تھی۔ معلوم تھا کہ مولانا پڑھانے کے لئے آرہے ہیں۔ مگر قاعدہ گڑیا کا گھر ہوگا۔ قاعدے کو گڑیا کے گھر سے کیا نسبت ہو سکتی ہے!

دوسرے روز صبح بھائی نے آواز دی "چلئے آپ کا قاعدہ آگیا ہے" میں ہرن کی طرح بھاگتی ہوئی برآمدے میں پہنچی۔ چنانچہ یہ ایک پتلی سی بے رنگ کتاب تھی جس کے پہلے صفحے پر آم، بکری، پتنگ وغیرہ کی تصویریں بنی تھیں، باقاعدہ بسم اللہ کی تقریب ہرگز نہیں ہوئی کس واسطے کہ بسم اللہ، روزہ کشائی، سالگرہ، وغیرہ کی رسوم بسلسلہ تحریک اصلاح معاشرت مدتوں قبل ترک کی جا چکی تھیں۔

لہذا اس طویل ورانڈے میں جس کے باہر سمندر پر سفید پرندے چکر کاٹ رہے تھے اور ڈیوک آف ولنگٹن، لارڈ آرتھر ویلزلے باغ میں گلہریوں کے تعاقب میں مصروف تھا اور دور سکول جیل میں گولیاں چل رہی تھیں میں دریائے علم میں غوطہ زن ہوئی۔

"کہو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ شروع کرتا ہوں" مولانا رب نواز نے قاعدے کے پہلے صفحے پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے ذرا ہل ہل کر کہا۔ "ساتھ نام اللہ کے"

"جی نہیں۔ شروع کرتی ہوں" میں نے اعتراض کیا۔

"اچھا۔ اچھا۔ پڑھو بیٹی۔ آگے پڑھو۔"

"شروع کرتی ہوں ساتھ نام اللہ کے"

---

[1] دکھا کے چلے جاگے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی جنس گراں کا

"سارے ملک، خصوصاً بنگال، یوپی اور صوبہ سرحد میں واقعات کی رفتار تیز ہوگئی۔ ہزارہا ستیہ گری جیلوں میں بند تھے۔"

دہشت پسندوں کی وجہ سے بنگال کی حالت کانگریس کے لئے خصوصیت کے ساتھ زیادہ نازک تھی۔ دہشت پسندی نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس میں پرامن ڈائریکٹ ایکشن زیادہ دشوار ہوگیا تھا اور حکومت کے شدید ترین جبر و تشدد کا اثر انارکسٹ اور پرامن دونوں تحریکوں پر یکساں پڑ رہا تھا۔ پولیس اور مقامی حکام وہ قوانین اور آرڈی نینس جو دہشت پسندوں کے لئے بنائے گئے تھے۔ کانگریس، مزدور اور کسان ورکرز پر بھی لاگو کر رہے تھے۔ جیل کے بلوے روزمرہ کے واقعات تھے جن میں حکام نہتے سیاسی قیدیوں کو مارتے پیٹتے تھے۔"

"دہشت پسندی کی مختلف زاویوں سے مذمت کی جا چکی ہے۔ لیکن اس کے ایک ممکن نتیجے سے مجھے خاص طور پر ڈر لگتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعے سارے ملک میں اچانک فرقہ وارانہ تشدد پھیل جانے کا خطرہ ہے۔ جس قوم میں مذہب سے اتنی شدید وابستگی ہو اس قوم کے لئے دہشت پسندی کے تصور کا عادی ہو جانا بے حد خطرناک ہے سیاسی قتل بے حد بری شے ہے۔ لیکن ایک سیاسی دہشت پسند کو سمجھا بجھا کر دوسرے سیاسی راستے دکھائے جا سکتے ہیں۔ مگر مذہب کے نام پر قتل، دینوی اور عالم بالا کے امور سے تعلق رکھتا ہے اور ان معاملات میں سمجھانے بجھانے یا عقلیت پرستی کا راستہ دکھلانے کی کوشش بھی بہت دشوار ہے اور اکثر اوقات ایک سیاسی قتل ایک مابعد الطبیعاتی طریقے سے نیم مذہبی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ آج دہشت پسندوں کو قوم پرستی، فسطائیت، امپریلسٹ فاشزم کا مقابلہ کرنا ہے۔"

"میں نے اپنی تقریروں میں دہشت پسندوں کی مذمت کی۔ لیکن دوسرے لیڈروں کی مانند ان لوگوں کو "بزدل" نہیں کہا۔ کیونکہ ایسے مردوں اور عورتوں کو جو اپنی جان کی بازی لگا رہے ہوں، بزدل کہنا خاص حماقت ہے۔"

"جب میں کلکتے سے روانہ ہو رہا تھا تو دو نوجوان مجھ سے ملنے آئے۔ وہ مجھ سے بے حد خفا تھے کہ میں ان کی دہشت پسندی کے خلاف پرچار کر رہا ہوں۔ وہ دونوں پیلے، نروس، ذہین چہروں والے نوجوان تھے۔ میری ٹرین کا وقت نزدیک تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے کام میں میری مداخلت برداشت نہیں کریں گے اور اگر میں باز نہ آیا تو جو حشر انہوں نے دوسروں کا کیا ہے۔ اسی طرح وہ میرا بھی فیصلہ کر دیں گے۔"

"اس رات، کلکتے سے روانہ ہوتے ہوئے اور ٹرین میں اپنی برتھ پر لیٹنے کے بعد مجھے ان نوجوانوں کے چہرے دیر تک مضطرب کرتے رہے۔ جوش اور نروس انرجی سے بھرپور یہ لڑکے کیسے غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔ مجھے افسوس رہا کہ وقت اتنا کم تھا ورنہ شاید ان سے مفصل بات چیت کر کے ان کو ملک کی خدمت اور حصول آزادی کے دوسرے راستے اختیار کرنے پر مائل کر سکتا۔ ان راستوں پر بہادری اور قربانی کے مواقع کی کمی نہیں۔ پچھلے برسوں میں مجھے اکثر ان کا خیال آتا ہے۔ مجھے ان کے نام کبھی نہیں معلوم ہو سکے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید وہ دونوں مر چکے ہوں۔ یا انڈمان کی کسی کوٹھری میں پڑے ہوں۔"[1]

ہندوستان میں ستیہ گرہ جاری ہے۔ انڈمان میں دہشت پسند قیدیوں کی بھوک ہڑتال اور اموات کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو ہندوستان میں بھی قید کر لیا گیا۔ ستمبر ۱۹۳۳ء میں رہائی اور دوبارہ گرفتاری کے درمیان مختصر وقفے میں پنڈت نے ٹیگور اور سی۔ ایف۔ اینڈریوز وغیرہ کے دستخطوں کے ساتھ ایک اپیل شائع کی جس میں انڈمان کے سیاسی قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک اور انہیں ہندوستان کی جیلوں میں منتقل کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ برطانیہ کے ہوم ممبر نے لندن میں اس اپیل پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا اور انڈمان کے سیاسی قیدیوں سے اظہار ہمدردی بنگال میں ایک قانونی جرم قرار پایا۔

---

[1] سوانح عمری از جواہر لال نہرو۔ جو جیل میں لکھی گئی اور ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

انڈمان سے واپس آنے کے چند روز بعد ایک صبح بھائی، اور میں والدہ اور ایک رشتے دار مہمان کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے ایک اجاڑ سی عمارت کے سامنے سے گزرے تو والدہ نے اچانک کہا۔ "وہ دیکھو سامنے جواہر لال بیٹھے ہیں۔"

جواہر لال نہرو ایک چھوٹے سے سنسان برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے دور پہاڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ سامنے کار رکتی دیکھ کر وہ کرسی سے کھڑے ہوگئے۔ میں اور بھائی اتر کر نیچی دیوار کی طرف بھاگے۔ جس کے سامنے مسلح سپاہی ٹہل رہا تھا۔ جواہر لال نہرو متبسم اور سوچ میں ڈوبے ہوئے چند لمحوں تک ہماری طرف دیکھتے رہے۔ سپاہی ٹہلتا ہوا ہماری سمت آیا۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ ہم لوگ کار کی طرف مڑے۔ پنڈت نہرو دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ کار آگے روانہ ہوگئی۔

"میں ساڑھے چودہ مہینے تک دہرہ دون جیل کی کوٹھری میں رہا۔ مجھے دوسرے جیلوں میں بہتر کوٹھریاں دی گئیں تھیں مگر دہرہ دون کی جیل کی ایک رعایت میرے لئے بے حد قیمتی تھی۔ یہ جیل بہت چھوٹا تھا اور ہم لوگوں کو قید خانے کی فصیل سے باہر لیکن جیل کے احاطے میں اندر ہی ایک مختصر سی حوالات میں رکھا گیا تھا۔ یہ جگہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں ٹہلنے یا چلنے پھرنے تک کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ ہمیں اجازت تھی کہ صبح و شام پھاٹک کے قریب ٹہل لیا کریں۔ یہاں سے ہمیں پہاڑ اور کھیت اور پبلک سڑک جو کچھ فاصلے پر تھی نظر آسکتی تھی۔ یہ رعایت خصوصیت سے میرے لئے نہیں بلکہ سارے "اے" اور "بی" کلاس قیدیوں کے لئے تھی۔ صرف وہی انسان جو طویل مدتوں کے لئے اونچی دیواروں کے پیچھے محصور کر دیا گیا ہو، چہل قدمی اور کھلی فضاؤں کے نظارے کی نفسیاتی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ مہینوں میں ان پہاڑوں کو جن سے مجھے عشق ہے، دیکھا کیا۔ کوٹھری میں سے مجھے پہاڑ نظر نہ آتے لیکن وہ میرے تصور میں موجود تھے۔ مجھے ان کی قربت کا احساس تھا۔ میرے اور پہاڑوں کے درمیان گہری یگانگت پیدا ہوگئی۔ دہرہ دون کا موسم گل بے حد خوشگوار ہوتا ہے۔"

"جاڑے نے درختوں کو پتیوں سے عاری کر دیا تھا۔ جیل کے پھاٹک کے سامنے پیپل کے چار شاندار درخت بھی اپنے پتے گرا چکے تھے۔ کہ اچانک درختوں میں خفیف سی جنبش اور سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ اور ایک پراسرار سی کیفیت اور فضا چاروں طرف چھا گئی گویا پس منظر میں بے حد خفیہ کارروائیاں کی جا رہی ہوں اور پھر نہایت سرعت کے ساتھ لاکھوں ننھی ننھی پتیوں نے دھوپ اور ہوا کے جھونکوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ لیکن برسات کے زمانے میں پانی سے بچنے کے لئے تنگ و تاریک کوٹھری کے ایک کونے میں سکڑ اور سمٹ کر بیٹھنا زیادہ خوشگوار نہیں تھا کیونکہ پانی چھت سے ٹپکتا اور مینہ کی بوچھاڑ کھڑکیوں میں سے اندر آتی۔ موسم خزاں دلآویز تھا اور سرما بھی لیکن جاڑوں میں جب طوفان باد و باراں گھرتا اور برستے اولے ٹین کی چھتوں پر گولیوں کی باڑھ کی طرح گرتے تو ایک نسبتاً معقول جگہ ذرا سی گرمی اور تھوڑے سے آرام کی خواہش پیدا ہوتی۔ کوٹھری میں ان گنت کھڑکیاں اور جھروکے تھے۔ چمگادڑیں جو اندھیرا پڑتے اڑتیں۔ مجھے ان سے سخت وحشت ہوتی۔ کھنڈروں میں چیونٹوں، دیمک اور چھپکلیوں، گلہریوں اور کبوتروں کو دیکھا کرتا۔ دہرہ دون جیل میں مہناؤں کے ایک جوڑے نے کوٹھری کے دروازے کے اوپر اپنا گھونسلا بنا لیا تھا۔ میں ان کو دانہ کھلاتا اور اگر ان کے کھانے کے وقت میں صبح و شام ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ میرے بالکل قریب آ کر پر شور احتجاج کرتے۔ دہرہ دون میں پرندوں کی افراط تھی۔ ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ حوالات کے صحن میں درخت نہیں تھے۔ صرف ان کی آوازیں سن سکتے تھے۔ میں ہوا میں بلندیوں سے تیرتے ہوئے عقابوں کو دیکھا کرتا۔ اکثر جنگلی بطخوں کی ڈار سر پر سے گزر جاتی۔ بچھو عموماً برسات کے زمانے میں خصوصاً (ملک کے مختلف جیلوں میں) ہماری کوٹھریوں میں پائے جاتے۔ مجھے تعجب ہے کہ مجھے کبھی کسی بچھو نے ڈنک نہیں مارا۔ حالانکہ یہ مجھے عجیب عجیب اور غیر متوقع جگہوں میں بھی ملتے رہتے تھے بستر پر۔ کبھی کسی کتاب کے اندر۔ تین چار سانپ بھی، (میری کوٹھریوں کے اندر یا ان کے آس پاس پائے گئے۔ ان میں سے صرف ایک کی خبر باہر نکل گئی تو اخباروں نے جلی سرخیوں میں شائع کی۔)

تاریخ کا ایک پورا دور گزر جانے کے بعد، ۷۵ء میں شاید اس سے قبل کراچی جم خانہ کی ایک دعوت میں ایک الٹرا فیشن ایبل اور عالی شان اور بے حد حسین و جمیل بیگم صاحبہ سے میری ملاقات ہوئی جو کسی بہت زبردست وی۔ آئی پی کی دوسری بیوی اور اس دعوت کی مہمان خصوصی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے بے حد بلندی پر سے اور خاصے سرپرستانہ انداز میں مجھ سے دو چار باتیں کیں۔ مے گلگوں کا خالی گلاس تپائی پر رکھا اور برقِ تبسم گراتی دوسری طرف مڑنے لگیں تو میزبان نے نزدیک آتے ہوئے کہا "ارے فرخندہ۔ یہ کیا۔ تمہارا گلاس تو خالی پڑا ہے۔"

"اب نہیں۔" بیگم صاحبہ نے ہاتھ اٹھا کر نزاکت سے انکار کیا۔

"ارے بھئی۔ کالا پانی کاٹ چکی ہو اور کالا پانی پینے میں اتنا بخل۔" میزبان مصر ہوئے۔ اتنے میں بیگم صاحبہ کے وی آئی۔ پی شوہر بھی اپنا گلاس تھامے قریب آکر بیٹھ گئے۔ کالے پانی کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا۔! "آپ کس زمانے میں تھیں کالے پانی میں؟" انہوں نے نہایت خوبصورتی سے سنی ان سنی کر دی۔ میں نے دوبارہ دریافت کیا "کس زمانے میں۔؟"

تب دفعتاً مجھے سوجھ گیا اور میں نے بے ساختہ انداز میں کہا "ارے آپ مولانا۔ مولانا رب نواز کی لڑکی تو نہیں۔؟" بیگم صاحبہ جو بہت دیر سے چہک رہی تھیں ایک دم چپ ہو گئیں اور مختصراً اور ذرا خشکی سے کہا۔ "جی ہاں۔"

"بھئی حد ہو گئی۔" میں نے جگمگاتے ہوئے مجمع کو اسی بیوقوفی کے عالم میں مخاطب کیا "بھئی یہ تو فرخندہ جمال نکلیں۔ ان کے والد مولانا رب نواز اس قدر سوئیٹ تھے اور ایسے نڈر۔ قیدیوں کے سامنے ایسے وعظ کہتے۔!" ایک صاحب نے حیرت سے سوال کیا "کہاں۔؟"

"پورٹ بلیر میں۔" میں نے جواب دیا۔ "خود سرکاری ملازم تھے لیکن ایسے لطیف پیرائے میں ایسی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے کہ انگریز حکام کھول کر رہ جاتے۔ مگر وہ وعظ اس انداز سے کہتے تھے کہ ان کی کسی بات کو گرفت میں نہ لایا جا سکتا تھا۔" اب مجھے مولانا رب نواز کے متعلق وہ ساری باتیں یاد آتی جا رہی تھیں جو بعد میں ایک مرتبہ والد نے بتائی تھیں۔ مثلاً یہ کہ مولانا ان قدیم وضع کے پٹھانوں میں سے تھے جو کسی سید سے پہلی بار ملتے ہی زیر لب درود شریف پڑھنے لگتے ہیں۔ "وہ زمانہ بے حد خطرناک تھا۔" میں نے بات جاری رکھی۔ "ہندوستان میں ٹیررسٹ موومنٹ زوروں پر چل رہا تھا۔ انڈامان کے سلور جیل میں روز سیاسی قیدیوں پر گولیاں چلتی رہتی تھیں۔ تیسری گول میز کانفرنس تو ہو چکی تھی۔ جنے کس سن میں ہوئی تھی بھئی کمال ہے۔" وی آئی پی، شوہر کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی اپنی دلہن کو۔ فرخندہ بیگم میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں اس قدر مجھ سے خفا نظر آ رہی تھیں۔

"مولانا رب نواز۔" میں نے قریب کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایک با اقتدار نئے سیاست دان کو جو اپنی سیاسی بد دیانتی اور ریشہ دوانیوں کے لئے بہت مشہور تھے مخاطب کیا "وہ اس نسل کے فرد تھے جس نسل نے دلیر زاد پیدا کئے۔ حالانکہ کوئی ان کا نام نہ تب جانتا تھا اور نہ اب کسی نے ان کا نام سنا ہے۔ وہ ایک فروتن اور غریب عالم اور صحیح معنوں میں مرد مومن تھے۔"

میزبان نے اس دوران میں فرخندہ بیگم کے گلاس میں شراب انڈیل دی تھی۔ فرخندہ بیگم نے ذرا جھک کر گلاس تپائی پر رہنے دیا۔ با اقتدار سیاست دان نے پہلو بدل کر سگریٹ جلایا۔ میں فضا کی ان OVERTONES سے قطعی بے خبر، اداسی سے کہتی رہی "مولانا اس قدر سوئیٹ تھے۔ آج برسوں بعد ایک دم اس طرح یاد آ گئے تو ایسا عجیب سا لگ رہا ہے۔ وہ مجھے الف بے پڑھاتے تھے۔ بغدادی قاعدہ بھی شروع کروانے والے تھے مگر ہم لوگ انڈامان سے جلدی واپس چلے آئے۔ وہ بھی کیا زمانے تھے۔ ہیں نا فرخندہ۔؟ مولانا کیسے ہیں۔؟ ان کو ضرور میرا آداب کہئے گا۔ اور آپ کی امی کیسی ہیں۔؟" آپ ہی بتائیے ایسا اتفاق روز روز کہاں ہوتا ہے کہ بچپن کے ساتھ کھیلے اس طرح غیر متوقع طور پر دوبارہ نظر آ جائیں۔ مگر فرخندہ بیگم جلدی سے معذرت چاہ کر اٹھیں اور میزبان کے ساتھ ڈانس فلور پر چلی گئیں۔ دوسرے لمحے ان کے شوہر بھی جو عنقریب ایک مرکزی وزیر بننے والے تھے ایک خاتون کے ساتھ رقص کرنے کے لئے وہاں سے اٹھ گئے۔ جب نامور سیاستداں بھی چند منٹ بعد دوسری طرف چلے گئے تو نزدیک بیٹھی ہوئی میری ایک ملاقاتی بیگم سراج نے آہستہ سے مجھ سے کہا "تمہاری بیوقوفی کی بھی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ جانتی ہو اس وقت تم نے کیا غضب کیا ہے؟"

"کیا ہوا۔؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"فرخندہ بیگم کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ ان کی آفیشیل عمر محض بائیس تیئیس برس کی ہے اور تم ہو کہ عین ان کے شوہر کے سامنے غدر کے وقتوں کی بڑی بوڑھیوں کی طرح گڑے مردے اکھیڑنے بیٹھ گئیں۔ ہندوستان کا ٹیررسٹ موومنٹ اور گول میز کانفرنس اور یہ اور وہ۔ بے کے ان کے شوہر کو بھونچکا کر دیا اور مستقل بیگم صاحبہ سے جرح کئے جا رہی ہو کہ کس زمانہ میں تھیں۔ غضب خدا کا۔ یہ زمانہ کی بھی ایک ہی رہی۔"

"اچھا۔ تو یوں کہوں۔" اب جا کر میری سمجھ میں آیا۔

"ان کے والد بے چارے کا بہت عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔"

"ارے۔" میں نے رنج سے کہا۔ "اتنے سوئیٹ تھے۔ مجھے دھندلے دھندلے ابتک یاد ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر آپ اس وی آئی پی مجمع کے سامنے یہ ثابت کرنے میں جٹی ہوئی تھیں کہ فرخندہ بیگم کسی بڑے آدمی کی صاحبزادی ہونے کے بجائے کسی نگوڑے جیل خانے کے سنکی واعظ کی بٹیا ہیں۔" میں نے ہکا بکا ہو کر سراج کو دیکھا اور تب مجھ پر پہلی بار اچانک یہ انکشاف ہوا کہ میں ان لوگوں سے کسی دوسری زبان میں بات کر رہی تھی۔

"ایٹیکیٹس گرانے میں تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے۔" بیگم سراج نے ساری کا پلو سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا اور مسکراتی ہوئی وہ بھی اپنے پارٹنر کے ساتھ ڈانس فلور پر چلی گئیں۔

دسمبر ۵۹ء۔ دلی کے ورلڈ اگری کلچر فیر میں ہندوستان کی ساری ریاستوں کے پویلین طرز تعمیر اور آرائش کے لحاظ سے اپنی اپنی تہذیبی روایات کے عکاس تھے۔ اتر پردیش کی عمارت لکھنؤ کے امام باڑوں کی وضع کی بنائی گئی تھی۔ راجستھان اور آندھرا اور بنگال کے پویلین محل، ایلورا اور بانس کے جھونپڑوں کے انداز کے تھے اور وہیں ٹروپیکل پودوں سے گھری ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چوبی کھمبوں پر ایستادہ ایک بنگلے پر نظر پڑی جس کی پیشانی پر "انڈامان و نکوبار" لکھا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ اندر دیواروں پر آزادی کے بعد سے جزائر کی صنعتی اور تعلیمی ترقی کے اعداد و شمار کے گراف آویزاں تھے۔ سفید ساڑھیوں میں ملبوس دو بنگالی لڑکیاں ایک کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھیں جن پر گھریلو دستکاریوں کے نمونے سجے تھے۔

"یہ سامان سلور جیل کے قیدیوں نے بنایا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سلور۔؟" یہ لڑکی نے دہرایا۔ دوسری سیلز گرل اس کے پاس آئی۔ "سلور جیل تو عرصہ ہوا ہوا ختم ہو چکا۔ انڈامان اب پینل سٹلمنٹ نہیں ہے۔ اب وہاں آزاد نئے انڈامانی بستے ہیں۔" دوسری لڑکی نے کہا۔

"نئے انڈامانی۔؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مشرقی بنگال سے آئے ہوئے زراعت پیشہ رفیوجیوں کو وہاں بسایا گیا ہے۔ ہم دونوں بھی ایسٹ پاکستان کے رہنے والے ہیں۔"

"انڈامان سیاحوں کی جنت ہے۔" پہلی لڑکی نے کہا۔ "کلکتے سے پورٹ بلیر ہفتہ وار فضائی سروس بھی ہے۔ کبھی آئیے۔!"

"ضرور۔!" میں نے اخلاق سے جواب دیا اور سامنے دیوار پر لگی آدی باسیوں یعنی جنگلی قبائل کے رقص کی تصویر دیکھنے لگی۔ "انڈامانی قبیلے کے اب صرف تیئیس افراد باقی ہیں۔ دوسرے قبائل کی تعداد چند سو رہ گئی ہے۔"

گو قدیم حجری عہد ابھی مہذب انسان کی جبلت میں ابھی تک زندہ ہے، مگر تاریک جنگلوں میں اس کے آثار ختم ہوئے۔

میں دوسری طرف مڑی اور تب اچانک مجھے بارہ بنگلہ کی ایک بہت بڑی تصویر دکھلائی پڑی۔ بارہ بنگلہ۔ میں ٹھٹھک کر گم صم تصویر کو دیکھنے لگی۔ بارہ بنگلہ جس میں اب جزائر کی حکومت کا کوئی اہم دفتر تھا۔ اپنے چوبی کھمبوں پر ایستادہ ثابت و سالم و محفوظ اسی طرح اپنی پہاڑی پر موجود تھا۔ میں محویت سے اسے دیکھا کی۔ اس کے فرانسیسی دریچوں کے شیشے اس طرح جھلملائے گویا جواباً وہ مجھے گھور رہا ہو۔ بارہ بنگلہ کے سامنے ربڑ کے درختوں کا جھنڈ موجود تھا۔ مگر ان کے سائے میں کھیلتا آرتھر ویلزلے وہاں نہیں تھا۔ حوالدار راجندر را اور مولانا رب نواز اور نور محمد اور پرکاش چند اور برمی ٹیوٹر اور مسٹر اینڈرسن نہیں تھے۔ ان دریچوں کے نیچے بیٹھ کر والد صبح کا اخبار پڑھتے تھے۔ سمندر کی سفید موجیں اسی طرح باغ کی ڈھلوان سے ٹکرا رہی تھیں۔ زندگی، مجھے معلوم ہوا، اسی طرح جاری رہتی ہے۔

وقت بدل جاتا ہے۔ آگے بڑھ جاتا ہے۔

جیولوجیکل وقت میں گھر سے انسان کی زندگی چیونٹی کی عمر سے بھی حقیر اور مختصر ہے، مگر زندگی جاری رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ وقت بدل جاتا ہے۔ آگے بڑھ جاتا ہے۔

کیونکہ، اس لمحے، اس تصویر کے سامنے کھڑی میں وہ ہستی نہیں تھی جو ان کمروں ان برآمدوں اور اس باغ میں کھیلتی اور کودتی پھاندتی تھی۔ منہ پھاڑ کر روتی تھی۔ کھانے کی میز کے نیچے بلی کے ساتھ چھپ کر بیٹھ جاتی تھی۔ میں ایک دوسری، قطعاً مختلف ہستی تھی۔

بارہ بنگلہ مجھے گھورتا رہا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد تم میرے سامنے آئی ہو تو مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو۔ اتنے عرصے، تم نے زندگی میں کیا کیا۔؟ اور مجھے سنانے کے لئے تمہارے پاس کیا ہے؟

میں جلدی سے کاؤنٹر کی طرف مڑی۔ "نئے انڈامانی" سیلز گرل نے اناس کے ریشے سے بنا ایک شاپنگ بیگ پیش کیا۔ "واجبی قیمت اور بہت مضبوط!" اگر میں اس لڑکی کو بتاتی کہ کسی زمانے میں، میں اس دیوار پر آویزاں تصویر کے اندر رہتی تھی تو اسے کتنا عجیب لگتا۔ یہ لڑکی ایک دوسری نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے دکھ دوسرے تھے۔ اس نسل کی قسمت میں جتنے دکھ لکھے تھے، سہہ چکی تھی، وہ آزاد برصغیر کی ROOTLESS نوجوان پیڑھی کی ایک فرد تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے پچھلے پچاس برس تک آزادی کی لڑائی لڑی ان کے قدموں کے نیچے ان کی اپنی دھرتی تھی۔ جس کی پائندگی اور تابندگی کی خاطر وہ لڑ رہے تھے۔ مگر اس نئی نسل کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ اس نسل میں ریفیوجی تھے اور نئے کلبیت پسند تھے اور ٹیڈی نوجوان تھے۔ منزل پر پہنچ کر منزلیں دھندلا گئیں تھیں۔

بارہ بنگلہ کی تصویر نے دوبارہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس پر نظر ڈال کر میں نے پھر خود کو یقین دلانا چاہا کہ اس شگفتہ، آرٹسٹک پویلین کے اندر موجود، میں ایک مختلف ہستی ہوں۔ بارہ بنگلہ مجھے گھورتا رہا۔

شاید میں اب بھی وہی بیوقوف، حیرت زدہ ہستی تھی جس کے خیال میں سمندر مزدوروں نے کھودا تھا۔ مسٹر اینڈرسن اپنی ٹانگیں علیحدہ کر کے گھر پر رکھ جاتے تھے اور قاعدہ گڑیا کا گھر تھا۔ اور یہ پرانی چوبی عمارت میری اس حقیقت سے واقف تھی۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لئے میں تیز تیز قدم رکھتی پویلین سے نیچے اتر آئی۔

نومبر ۶۱ء۔ کلکتے کے مہاجتی سدن میں للت کلاکندر کی سالانہ میوزک کانفرنس شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ بڑے غلام علی خان، بسم اللہ خان، مشتاق علی خان، بیگم اختر اشتیاق اور دوسرے بڑے فنکاروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے باہر سڑک پر بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ لیکن ہال ابھی خالی پڑا تھا۔ میرے ساتھی زینے کے نیچے باتوں میں مصروف تھے۔ میں ٹہلتی ہوئی ہال کے اندر چلی گئی اور ہال کی دیواروں پر آویزاں روغنی تصاویر کی قطاروں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سارے ہال میں کئی سو تصویریں رہی ہوں گی۔ جن کے نچلے کونوں میں بنگال کے نامور فنکاروں کے دستخط تھے۔ یہ کس قسم کی پورٹریٹ گیلری ہے میں نے ذرا تعجب سے سوچا اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ان تصویروں کے قریب گئی۔

متجسس، بے چین آنکھیں، پرسکون اور آنکھیں، اداس تبسم، مطمئن شانت تبسم، مسرور چہرے۔ سنجیدہ چہرے، مضطرب اور سوچتے ہوئے چہرے، یہ کون لوگ ہیں۔؟ حیرت کے ساتھ میں نے تصاویر کے نیچے

پیتل کی چھوٹی چھوٹی تختیوں پر منقش نام پڑھنے شروع کیے۔

خودی رام باسو ۔	پھانسی ۱۹۰۸ء
پرفلا چکی	جیل میں خودکشی ۱۹۰۸ء
اشفاق اللہ	پھانسی ۱۹۲۹ء
بھگت سنگھ	پھانسی ۱۹۳۱ء
پرتی لتا واڈیدا	خودکشی ۱۹۳۲ء
راجندر لہری	پھانسی ۱۹۲۷ء
گوپی ناتھ ساہا	پھانسی ۱۹۲۴ء
جتیش گوہا	پولیس کے مظالم سے مرے ۱۹۳۰ء
دیپ پرشاد گپتا	گولی ماردی گئی۔
ماتانگنی حاجرہ	پولیس کی گولی سے شہید ۱۹۴۲ء
سدھیر کمار بوس	انڈامان میں بھوک ہڑتال سے مرے۔

میں ٹھٹھک گئی۔ سدھیر کمار بوس۔ انڈامان میں۔ بھوک ہڑتال سے مرے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ "یہ میرے بڑے بھائی تھے۔" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک خستہ حال کھچڑی بالوں والا دبلا پتلا آدمی میرے پیچھے کھڑا مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "آپ ان تصویروں کو بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھیں۔" اس نے میرے برابر آکر کہنا شروع کیا۔ "آپ تو ان کے نام بھی نوٹ کرتی جارہی ہیں۔ آپ کیا جرنلسٹ ہیں۔؟"

"میں شاید آپ کے بھائی کی ایک جھلک دیکھ چکی ہوں۔"

"دادا کو دیکھ چکی ہیں آپ۔؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے بجد تعجب سے پوچھا۔

"آ۔ کم آن ہنی (HONEY)" ایک گورا چٹا ٹیڈی بوائے اپنے نوکیلے جوتوں پر تیرتا ہوا آکر میرے اور تصویر کے درمیان حائل ہوگیا جہاں سے وہ اپنی گرل فرینڈ کو آواز دے رہا تھا جو ہال کے دوسرے سرے پر شاید اپنی کرسی تلاش کررہی تھی۔

"ہائی ڈوپ۔ کم آن ہیر۔" لڑکی نے جو بے حد تنگ شلوار اور اس سے بھی زیادہ تنگ قمیص میں جکڑی ہوئی تھی، ٹیڈی بوائے کو جواباً پکارا۔ ٹیڈی بوائے اسی طرح نوکیلے جوتوں پر تیرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اسکی چست سیاہ پتلون کی نازک کمر پر بندھی نقرئی بیلٹ روشنی میں جگمگا رہی تھی۔

مدقوق بنگالی نے پھر مجھ سے بات شروع کی "میں بھی کرانتی کاری تھا۔ آدھی زندگی جیل میں کاٹی ہے" اس نے اداسی سے کہا۔ "آپ۔ آپ آرٹیکل لکھیں گی۔؟" "شاید۔ پتا نہیں۔"

"میرا نام پربودھ کمار بوس ہے۔ میں باریسال کا رہنے والا ہوں۔ دادا کے انڈامان جانے کے وقت میں اسکول میں تھا۔ دادا کے غم میں روتے روتے میری ماں بھی مرگئی۔ مگر میں اسکول سے نکلتے ہی موومنٹ میں شامل ہوگیا اور جیسور میں پکڑا گیا۔ بارہ برس علی پور جیل میں بند رہا۔ آزادی کے بعد آزادی ملی۔ تب میرا ضلع دوسری طرف جاچکا تھا۔ اب میں۔ اب میں۔۔"

ٹیڈی بوائے برق رفتاری سے پھر واپس آیا۔ اب کے اس کے ساتھ چند امریکن بیٹ نک BEATNIKS جن میں سے ایک نے سیاہ شیروانی چوڑی دار پاجامہ اور ایک کلائی میں چاندی کا کڑا پہن رکھا تھا۔ دوسرے امریکن بیٹ نک نے خاکی نیکر پر بنگالی کرتا پہنا ہوا تھا۔ تیسرے امریکن بیٹ نک نے مغربی لباس ہی پر اکتفا کیا تھا مگر وضع قطع سے لڑکی معلوم ہوتا تھا۔ امریکن بیٹ نک لڑکی، حلیئے سے لڑکا دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سب اسٹیج کے نیچے کھڑے اس انگریز لڑکی شرلے کی سمت جارہے تھے جو ہندوستانی رقص سیکھنے کے لیے انگلستان سے آئی ہوئی تھی اور برجو مہاراج کی شاگردی میں کتھک کی مہارت حاصل کرنے کے بعد آج شام اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی تھی۔ ہندوستانی ٹیڈی بوائے نے مدقوق انقلابی کو بازو کی ایک جنبش کے ساتھ اپنے راستے سے ہٹایا اور اپنے بیٹ نک مہمانوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ عین اس وقت مارواڑی سیٹھوں، سوسائٹی لیڈیز، پروفیشنل انٹلکچوئیلز اور کلچرل ولچرز (CULTURE VULTURES) کا ایک ریلا برابر کے دروازے سے ہال میں داخل ہوا۔ اور مدقوق انقلابی اس ریلے میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے اسکی تلاش میں چاروں طرف دیکھا۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ میں اس کے دادا کی کہانی ضرور لکھوں گی۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ میں سارے برصغیر کی کہانی جاننا اور لکھنا چاہتی ہوں[1]۔ مگر یہ کہانی سننے اور سنانے کے لیے محض ایک حیات مستعار بے حد ناکافی ہے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اس کے دادا ہی وہ جوشیلے نوجوان تو نہیں تھے جو غصے میں بھرے پنڈت جی کے پاس پہنچے تھے۔ مگر وہ گمنام تباہ حال کرانتی کاری اس زرق برق، بے پروا، خوش باش، آسودہ حال مجمع میں کہیں کھو چکا تھا۔ اسٹیج پر جل ترنگ بجنا شروع ہوگئی۔[2]

◆◆◆◆

[1] انقلابی

[2] یہ کہانی میں نے پچھلے سال لکھی تھی۔ حال ہی کی خبر ہے کہ چچا مہدی، ایک پرانے انقلابی جن کی پھانسی کی سزا حبس دوام میں تبدیل کردی گئی تھی اور جو بیس برس تک انڈامان میں قید رہے، پچھلے دنوں انہوں نے لاہور میں گمنامی اور شدید مفلسی کے عالم میں انتقال کیا۔

ترقی پسند ادب

احمد ہمدانی

ترقی پسندی ایک انسانی رویہ کا نام ہے۔ یہ انسانی رویہ سائنسی مزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک عجیب صورت حال یہ ہے کہ ہم سائنسی تعلیم پر تو بہت زور دے رہے ہیں۔ لیکن سائنسی مزاج سے حد درجہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ ہماری اس خوفزدگی کا اندازہ صرف اس ایک بات سے کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان نے ایسے بڑے بڑے سائنس داں تو پیدا کردیئے جنھیں بین الاقوامی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا اور ان میں سے کچھ کو نوبیل پرائز تک سے نوازا گیا لیکن یہ بڑے بڑے سائنسداں جب معاشرتی کوائف پر گفتگو کرتے ہیں تو سائنس کے ہر تقاضہ کو فراموش کردیتے ہیں۔ سائنسی علوم سے دلچسپی اور سائنسی مزاج سے اجتناب ہمارا ایک ایسا المیہ ہے جو قومی سطح پر ہمیں ریاکارانہ زندگی گزارنے پر مجبور کررہا ہے۔ سائنسی مزاج اور عقلی رویہ کو اپنانے کا احساس سب سے پہلے سرسید تحریک کی صورت میں ابھرا تھا تاہم یہ تحریک مکمل طور پر سائنسی مزاج پیدا کرنے کے بجائے عقلی رویہ ابھارنے تک محدود رہی۔ سائنسی مزاج کی ترویج کے سلسلہ میں ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک ہی اصل تحریک ہے جس نے اس سلسلے میں عملی اقدام کیا۔ ہمارے ادب میں صرف دو ہی تحریکیں ایسی ہیں جو ہماری معاشرتی سوچ اور علمی وادبی تخلیقات پر اثرانداز ہوئی ہیں۔ سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک کے بڑے بڑے مخالف بھی اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان دونوں تحریکوں کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب سے ہمارے ادبی وقار میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔

ترقی پسندی کے سلسلے میں کچھ لوگ سخت غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ ترقی پسندی سے مراد اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ ترقی وارتقاء — حیاتیات ہی کا نہیں بلکہ معاشرے کا بھی اصول ہے۔ یوں تو اصول ارتقاء کو یونانی مفکرین کے علاوہ ابن مسکویہ جیسے مسلم مفکرین اور مولانا روم جیسے عارفین پہلے ہی بیان کرچکے تھے لیکن سائنسی بنیادوں پر اس کی تشریح علم حیاتیات کے ماہر ڈارون اور اس کے ہم عصروں نے کی۔ ان سائنس دانوں کے بعد سے ارتقاء کے سائنسی نظریہ پر برابر کام ہوتا رہا چنانچہ حیاتیات سے الگ معاشرتی ارتقاء پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ معاشرتی ارتقاء کا تصور ادب میں ترقی پسندی کی تحریک کی بنیاد ہے۔

سائنسی انکشافات سے پہلے دنیا کے تمام روایتی معاشرے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انسانیت زوال پذیر ہے۔ کلجگ وغیرہ کے تصورات اس یقین کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن سائنسی انکشافات کے بعد ذہن انسانی پر یہ روشن ہوا کہ نوع انسانی من حیث المجموع اپنی معاشرتی زندگی میں ارتقاء پذیر ہے۔ مثلاً ریل گاڑی کی ایجاد کو بیل گاڑی کے مقابلہ میں ترقی کا عمل نہ کہنا کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں۔ سائنسی ایجادات نے پیداواری طریقوں اور پیداواری نظام میں زبردست تبدیلی پیدا کی جس کی وجہ سے انسانی فکر اور طرز احساس میں تبدیلیاں آئیں۔ اس بدلی ہوئی فکر اور بدلے ہوئے طرز احساس کو تخلیقی عمل کے دوران میں بروئے کار لانا ترقی پسندی کی پہلی شرط ہے اور پھر بات طرز فکر و طرز احساس کو صرف بروئے کار لانے ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ شعر وادب کو خیالی دنیا سے اتار کر اور روزمرہ زندگی سے ہم آہنگ کرکے ادب کے لیے زندگی کی ترجمانی کے ساتھ اسے نکھارنے سنوارنے اور آگے بڑھانے میں مدد کرنا بھی ضروری ہے۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کا مقصد یہی تھا کہ ادب میں سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ سماج کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں ہمارے شعری اور افسانوی ادب نے بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان خدمات کو نہ سراہنا ادب کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے۔ البتہ ترقی پسند تحریک میں کچھ ایسے لوگ ضرور شامل ہو گئے تھے جو اس تحریک کی روح سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے صرف ترقی پسند موضوعات ہی کو اپنایا اور ادب کے جمالیاتی پہلو کو نظرانداز کردیا جس کی وجہ سے کچھ لوگوں نے ترقی پسند ادب کو پروپیگنڈہ کہہ کر مسترد کرنا چاہا لیکن یہ معترضین کی زیادتی تھی کیونکہ ترقی پسندوں کے تخلیق کردہ ایک معمولی سے حصہ کو پورے ادب پر منطبق کردینا کسی طرح بھی درست نہ تھا۔

برصغیر کی تقسیم اور سامراجی حکمرانوں سے چھٹکارے کے بعد ملک کی سیاسی فضا میں تبدیلی آئی جس کی وجہ سے ترقی پسند ادیبوں کے موضوعات بھی بدل گئے، اب انھیں سامراجی طاقت کے بجائے خود اپنے بھائیوں کا سامنا تھا۔ اس مقابلہ میں ایسا وقت بھی آیا کہ پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگادی گئی۔ بہر حال یہ پابندی انجمن پر لگائی گئی تھی انسانی سوچ پر اس کا اطلاق ممکن نہیں تھا چنانچہ انجمن پر پابندی کے باوجود ترقی پسند اذہان اپنا کام کرتے رہے اور آخر کار جب موقع ملا تو ۱۹۸۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا پچاس سالہ جشن لندن میں اور ۱۹۸۶ء میں پاکستان اور ہندوستان میں منعقد کیا گیا۔ جشن کی ان تقریبات سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ جس تحریک کو پابندیوں کی وجہ سے مردہ سمجھ لیا گیا تھا وہ درحقیقت پوری طرح زندہ اور فعال ہے۔

آج کل نوع انسانی کے سامنے سب سے بڑا خطرہ جنگ ہے چنانچہ مذکورہ تینوں تقریبات میں ترقی پسند ادیبوں نے امن کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا اور طے کیا کہ وہ اپنی تخلیقات میں قیام امن کی اہمیت کو پوری طرح ابھاریں گے لیکن اپنی تحریروں میں جمالیاتی قدروں سے غفلت کسی قیمت پر گوارا نہیں کریں گے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے نوجوان ترقی پسند ادب کے افادی پہلو سے پوری طرح آگاہ ہوتے اور اسے تسلیم کرنے کے باوجود ادب کی جمالیاتی قدروں سے ذرہ برابر غافل نہیں ہیں۔ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا یہ رویہ ہمارے ادب کے لیے ایک نیک شگون ہے۔

روشنی اور خوشبو

رحمت اللہ مانیوٹھی

"انقلاب!!؟..." بے نیاز شخص نے حیران ہو کر پوچھا، ہمارے جسموں میں گولیاں داغنے والو ہم لکیروں کے قیدی نہیں رہیں گے

اس نے ایک معاندانہ نظر لکیروں پر ڈالی۔
لکیریں، ترچھی، سیدھی، گنجلک، کسی کنوارے نوجوان کے بستر کی چادر کی طرح الجھی الجھی۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسی مسکراہٹ جیسی کسی مصور کے چہرے پر اپنے لافانی شاہکار کو نظر بھر کر دیکھنے سے ابھرتی ہے۔

ایسی مسکراہٹ جو ایک ماں کے چہرے پر اپنے پہلوٹھی تخلیق کو دیکھتے ظاہر ہوتی ہے۔

اس نے بڑی چاہ سے لکیروں پر ہاتھ پھیرا، لکیریں گدگدی کے انداز میں مسکرانے لگیں اور اس کے چہرے پر معاندانہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ اس نے کتنی محبت سے لکیریں کھینچی تھیں۔ لکیریں سرحدیں ہیں جیون سرحدیں..... ہماری یہ سرحدیں۔

اس نے سرحد کے اندر قید علاقے پر نگاہ ڈالی اور پہلی بار اس کا چہرہ سوالیہ علامت بن گیا۔ اس نے حیرت سے اس شخص کو دیکھا۔ وہ شخص جو سرحدوں کے اندر قید علاقے میں سب سے بے نیاز ہو کر بیٹھا تھا۔

سرحدوں کا خالق آگے بڑھا اور اس بے نیاز شخص کے قریب پہنچ گیا۔ اس بے نیاز شخص نے اچٹتی نگاہوں سے سرحدوں کے خالق کو دیکھا اور اسی لمحے وہ کھانسی کے شدید دورے میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے بلغمی تھوک پھینکا، تھوک جس میں خون شامل تھا..... خون جس میں کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں کی آمیزش تھی۔

"ارے، تم آج بھی اداس ہو؟ تعجب ہے! ارے دیکھو تو انقلاب آ چکا ہے۔ اب یہ سرحدیں تمہاری ہیں، تمہاری اپنی، ہاں۔ اب تمہارے اوپر کوئی اجنبی اور غیر ملکی حکمران مسلط نہیں رہا۔ اب تمہارا حکمران بھی میں ہوں۔ تمہارا بھائی۔ ہاں!"

اس بے نیاز شخص نے ایک سرسری نگاہ حکمران پر ڈالی اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری اور قطعی سپاٹ تھا۔

"کیوں بھائی، تمہیں انقلاب آنے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی؟"

"انقلاب!!؟..." بے نیاز شخص نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں، انقلاب، عظیم انقلاب۔ تمہارے اوپر مسلط غیر ملکی حکمران دھکیلا جا چکا ہے اور اب میں تمہارا حکمران ہوں۔ تمہارا اپنا حکمران۔"

"میرا اپنا..... حکمران؟" دوبارہ اس نے حیران ہو کر کہا "حکمران تو بس حکمران ہوتا ہے۔ اپنا ہو یا پرایا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ پہلے بھی میرا لہو، سیاہ نہیں بلکہ کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں بن کر آکاش کی سمت اٹھتا تھا اور دھواں لہو کا روپ دھار کر میرے وجود کے اندر سے بلغم کی صورت میں باہر نکلتا رہا ہے..... آج بھی ایسا ہی ہے۔"

"گویا تمہیں انقلاب آنے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے!؟"

"جب میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو مجھے کسی بھی طرح کا انقلاب نظر نہیں آیا..... اور میں ان دیکھی اشیاء پر یقین نہیں رکھتا۔"

"انقلاب حقیقت ہے اور تمہیں حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔"

"میں اس روز آہن گر کی بھٹی میں بیٹھا ہوا تھا۔ آہن گر کے بچے گلیوں سے بے نیاز اپنے گندے پانی کے جوہڑ میں کاغذ کی کشتیاں ڈال کر کھیل رہے تھے۔ آہن گر کی بیوی مارتول

سے گرم تپتے سرخ آہن کو چوٹیں مار رہی تھی جیسے اُس کے میاں نے گرم گرم بھٹی سے نکال کر باہر رکھا تھا۔ اُس وقت تمہارا کارندہ آیا تھا اس نے انقلاب آجانے کی نوید سنائی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔ "مبارک ہو تم لوگوں کو، آج تم سب آزاد ہو۔" آہن گر نے گردن اٹھا کر تمہارے کارندے کی طرف دیکھا، پھر اُس نے گردن گھما کر اپنے بچوں کو دیکھا جو گندے پانی کے جوہڑ میں کاغذ کی کشتیاں بہا کر کھیل رہے تھے اور ایک دوسرے کو غلیظ اور گندی گالیاں دے رہے تھے... اُس نے پسینے میں نہائی ہوئی اپنی بیوی کو دیکھا ... پھر اُس نے بھٹی کے چھت سے بندھے جھولنے میں بیمار بچے کو دیکھا۔

اُس نے کہا "سب کچھ ویسا ہی تو ہے جیسے پہلے تھا۔ مجھے تو انقلاب بالکل بھی نظر نہیں آتا... پرہاں اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پہلے محصول لینے کے لیے ایک غیر، ایک اجنبی آیا کرتا تھا وہ آج نہیں آیا ہے... یہ فرق ضرور ہوا ہے۔"

"آج میں آیا ہوں محصول وصول کرنے" تمہارے کارندے نے کہا۔ "انقلابی سرکار نے محصول میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے... انقلاب کے دوران پہنچنے والے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے۔"

"آہن گر نے محصول میں اضافی ادائیگی سے انکار کیا اور تمہارے کارندے نے اس کے جسم میں گولی داغ دی۔ انقلاب کے خلاف بولنے کے جرم کی بناء پر۔"

"ہاں، انقلاب کے خلاف بولنا جرم ہے اور باغی کی سزا موت ہے، تمہارے آہن گر دوست کے ساتھ بالکل ٹھیک اور مناسب انصاف کیا گیا ہے۔"

"انصاف!!؟ ایسا انصاف تو پہلے بھی مروّج تھا۔ پھر انقلاب کی...؟"

حکمران نے اس کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے کہا۔ "پہلے رائفل غیر کے ہاتھ میں تھی اور اب یہ تمہارے اپنے بھائی کے ہاتھ میں ہے۔"

"رائفل تو بس گولیاں اگلتی ہے پھر چاہے وہ غیر کے ہاتھ میں ہو یا پھر اپنے ہاتھ میں... میں چاہتا ہوں رائفل کی گولیوں کے بجائے گلاب کی پتیوں کی برکھا ہو۔"

"تم شاعر ہو گیا؟"

"نہیں، محنت کش ہوں۔"

"اچھا... تو گویا یہ اطلاعات درست ہیں کہ محنت کش انقلاب کے مخالف ہیں۔"

"نہیں انقلاب کی سب سے زیادہ ضرورت تو ہمیں ہے، ہم محنت کشوں کو... انقلاب... ایک تبدیلی... جس میں اوپر موجود سب نیچے اور نیچے والے اوپر آجاتے ہیں... محض ایک ہی دائرے میں گردش نہیں کرتے رہتے ہیں۔"

حکمران پلٹ کر، اپنی زرنگاہ، کرسی پر بیٹھ گیا۔ محنت کش آگے بڑھا۔ "کل انقلابی کونسل کی کارروائی کا فوٹو آپ کے روزنامے میں ہم نے دیکھا، تصویر میں وہی لوگ بیٹھے تھے جو غیروں کے ساتھ بھی ہوا کرتے تھے۔"

"اب وہ انقلابی ساتھی ہیں... غیر یہاں سے چلے گئے ہیں۔" محنت کش کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ پھیل گئی، زہریلی مسکراہٹ، انتہائی تلخ، وہ کچھ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "گرفت وہی ہے بس ہاتھ بدل گیا ہے۔"

حکمران سرگوشی نہیں سن سکا۔

"دیکھو لکیروں کے اس طرف... وہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔" حکمران نے اُس کے رویّے کو پرکھنا چاہا۔

محنت کش نے گردن گھما کر دیکھا۔ لکیروں کے دوسری جانب شکستہ جھونپڑیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ اُسے کشش سی محسوس ہوئی۔ حکمران جو کچھ پرکھنا چاہ رہا تھا بھانپ گیا۔ اُس نے کہا "سرحد عبور کرنے کی اجازت انقلابی حکومت نے کسی کو بھی نہیں دی ہے۔"

محنت کش نے آکاش کی طرف دیکھا۔ سورج چمک رہا تھا، کرنیں لکیر کے دونوں جانب بلا امتیاز اپنی روشنی برسا رہی تھیں۔ محنت کش نے سرحد کے اُس طرف گلاب کی کیاریوں کو دیکھا... خوشبو اُس طرف سے، اِس طرف ہوا کے سنگ سنگ آکر پھیل رہی تھی۔ خوشبو سرحد کے چیک پوسٹ پر رکی نہیں اُسے پاسپورٹ، ویزا کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی... خوشبو، ہوا، روشنی، جغرافیائی سرحدوں کی قید اور "انقلابی حکومت" کی گرفت سے کتنی آزاد ہیں۔

اس نے سوچا "انسان کو بھی خوشبو، ہوا، روشنی کی شکل میں ہونا چاہیے تھا۔" ایک دم اُس نے محسوس کیا کہ وہ ہوا ہے، روشنی ہے، خوشبو ہے۔ محنت کش خوشبو۔ وہ آگے بڑھا گویا سحر زدہ ہو گیا ہو۔

"کہاں جا رہے ہو!؟"

"لکیروں کے اُس طرف۔"

"وہ تمہارے دشمن ہیں۔"

"میرے دشمن!!؟... مگر اُس طرف دیکھو تو سہی۔"

حکمران نے دیکھا، سرحد کے اُس طرف نیم برہنہ بچے جھونپڑیوں سے باہر کھڑے تھے اور بیمار، نحیف، مدقوق لوگ بانہیں پھیلائے محنت کش کو صدائیں دے رہے تھے۔

"نہیں" حکمران گرج کر بولا "یہ تمہارے دشمن ہیں۔"

"جن کے دکھ درد، لذتیں امنگیں، تڑپ اور احساس ایک جیسے ہوں، وہ بھائی ہوتے ہیں۔"

"تمہارے بھائی صرف ہم ہیں۔"

"تم اور میں جنموں کے دشمن، یگوں سے برسرپیکار تمہارے اور میرے درمیان سندھو کے کناروں ایسا انمٹ فرق اور اختلاف... تم میرے بھائی کیسے ہو سکتے ہو!!؟"

"نہیں... تم لکیروں کے اس طرف نہیں جاؤ گے، دیکھو میرے ہاتھ میں رائفل ہے۔" حکمران نے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ "میری انگلی کی ہلکی سی جنبش تمہارے پیٹ میں ایسی چیز داخل کر دے گی جو تم نے منہ سے کبھی نہ چکھی ہوگی۔"

محنت کش نے پہلی بار حکمران بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اُسے لگا گویا رائفل کی نال "صورِ اسرافیل" ہے اور "صور" کے دوسرے سرے پر اسرافیل کے ہونٹوں کے بجائے حکمران بھائی کی انگلی رکھی ہوئی ہے۔ محنت کش کو اپنا آہن گر دوست یاد آنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں بے پناہ نفرت امڈنے لگی، اُس نے زقند لگائی اور سرحد کو عبور کرنے لگا۔

حکمران بھائی کی انگلی میں جنبش ہوئی۔ گولی سرحد کو پار کرتی ہوئی محنت کش کے پیٹ میں اتر گئی۔ محنت کش سرحد کے اُس طرف تڑپنے لگا، اُس کے جسم سے فوارہ بن کر اُبلتے ہوئے لہو نے دھرتی کے سینے پر لاتعداد انمٹ نعرے رقم کر دیے۔

حکمران بھائی کا قہقہہ فضاؤں میں پھیل گیا۔ اُس کے قہقہے میں اُس کے کارندے بھی شامل ہو گئے۔ "باغی... باغی، انقلاب دشمن تمہارا انجام یہی ہونا تھا۔"

سرحد کے اُس طرف سے کمزور لوگوں کی چیخیں بلند ہوئیں وہ آگے بڑھ آئے۔

"ہمارے جسموں میں گولیاں داغنے والو! ہم لکیروں کے قیدی نہیں رہیں گے، ہم ہوا ہیں، روشنی ہیں، خوشبو ہیں، محنت کش خوشبو..."

لکیروں کے اس طرف حکمرانوں کے قہقہے دیر تک گونجتے رہے۔

عشرت آفرین

اس سیلِ بلا کی کچھ خبر ہے
جو شہرِ پناہ کے اِدھر ہے
اے وقت وہ کون خوش خبر ہے
وہ جس کی دعاؤں میں اثر ہے
ہاں درد کی فصل کاٹتے ہیں
اور ہاتھ میں کاسۂ ہنر ہے
آنکھوں میں ہے دھول آسماں کی
اور دل میں نئی زمیں کا ڈر ہے
ہر گام عذاب ہجرتیں ہیں
ہر سمت مِرا ہی، میرا گھر ہے
تا دور بس ایک موجِ خوناب
تا دیر بدن میں جاں اگر ہے
تاریخ لگان مانگتی ہے
اور اپنی ہتھیلیوں پہ سر ہے

سعادت حسن منٹو

۴۷ء کا زمانہ بمبئی سنٹرل اسٹیشن چمکیلی خوشگوار صبح سورج کی کرنیں پلیٹ فارم پر ترچھی پڑ رہی تھیں۔ میں لوکل کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اتنے میں میری ہم جماعت نظر آئی۔ سلام و کلام کے بعد ہم کالج کی باتیں کرنے لگے لیکن میں کچھ الجھن سی محسوس کر رہا تھا جو میرے بالکل قریب دو بڑی چمکدار آنکھیں عینک کے شیشوں سے ہم پر فوکس کی طرح پڑ رہی تھیں۔ میں اس کے سامنے جیسے ایک نومشق اداکار کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ معمولی آنکھیں نہیں تھیں۔ وہ آنکھیں تھیں اردو کے منفرد ادیب و افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی!

اسی پلیٹ فارم پر منٹو کی ہم نے ایک اور شرارت دیکھی کہ انہوں نے چلتے چلتے دانستہ اپنا رومال ایک خوبصورت لڑکی کے آگے گرا دیا اور اٹھانے کے لیے جھکے تو ان کی نظریں رومال کے بجائے لڑکی کے چہرے پر تھیں۔ یہ تھا منٹو کا اپنا انداز، زندگی سے کندھا رگڑنے کا اور ان سے کہانیاں اخذ کرنے کا!

میں اس زمانے میں کھیڑا پارسی کی ایک کھولی میں رہا کرتا تھا اور صبح صبح پیدل بمبئی سنٹرل اسٹیشن جایا کرتا وہاں سے لا کالج کے لیے چرچ گیٹ جانے والی لوکل پکڑتا۔ میری سب سے خوشگوار حیرت کہ منٹو مرحوم تقریباً روز ہی ناگپاڑے سے ساروی ہوٹل کی بغل سے نکلتے اور اسی راستے سے بمبئی سنٹرل اسٹیشن آتے اور پھر گورے گاؤں جانے والی لوکل پکڑتے۔ صاف ستھرا لمبی آستینوں کا سفید براق کرتا اور ویسا ہی سفید براق بڑی چوڑی موریوں کا پاجامہ پہنے چوڑے چکلے ماتھے کے نیچے سیاہ فریم کی عینک اور پیروں میں براؤن چپل پہنے ان کی چمکدار اور شفاف آنکھیں اپنے گرد و پیش کا مسلسل مطالعہ کرتی دکھائی پڑتیں۔ ہر حرکت سے مکمل آگہی بلکہ ان کے اندر نگاہِ شوق محض ایک اصطلاح نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں نظر آتی۔ یہ وہی گندہ گاہ بلاسس روڈ تھی جس کے وسط میں الیگزینڈر ٹاکیز بغل میں فورلیس روڈ کی رہگذر اسی پر سے منٹو کی شہرۂ آفاق کہانیاں ہتک، خوشیا، دیوالی کی رات وغیرہ ہم تک پہنچیں۔

مجھے یاد ہے اسی روڈ کے نکڑ پر پروفیسر سامری کا جادوئی و طلسماتی کلینک تھا جس کے ماتھے پر ایک بڑا سا بورڈ انتہائی بھیانک اور منحوس جس پر جنات اور شیاطین کی سینگوں والی تصویریں، انسانی کھوپڑیاں، گول کرسٹل، ایک کونے پر بڑی شعلہ بار آنکھیں۔ بورڈ کیا تھا۔ پنڈورا یا بھان متی کا پٹارہ تھا۔ اس کے اطراف میں کماتے والیاں اپنے بیگنی چہروں پر سستے پوڈروں کا لیپ لگائے نوگزی ساڑیاں اور بھڑکیلے بلاؤز پہنے کولہے مٹکاتی آنکھیں مارتی ہر خاص و عام کو دعوتِ جنس دیتیں۔

۱۹۰۶ء کا غیر جذباتی رپورٹر بمبئی گزیٹیر میں یوں رقم طراز ہے۔

۱۸۹۰ء میں فورلیس روڈ کماٹی پورہ طوائفوں کے دیوان خانے ہیں جہاں شام کو رقص و سرود کی محفلیں ہوتی ہیں اور رات گئے تک راگ و رنگ کی محفلیں ہوتی ہیں۔ کہیں مکانوں میں جو پنجرہ نما ہیں، عورتیں کھڑی رہتی ہیں۔

ریست بڑھوا کا مصنف مسٹر بلا باری لکھتا ہے کہ

"اس وقت (۱۹ ویں صدی) بمبئی میں نصف تعداد ان کسبیوں کی ہے جن کے شوہر یا بھائی ان بھاڑے مار واڑیوں کے قرض کے مارے ہوئے ہیں (بحوالہ تمدنِ ہند موسیولی بان)

بمبئی کے اس غلیظ علاقے کے بارے میں جب منٹو نے اپنا نشتر جیسا نوکیلا قلم اٹھایا تو بس نے بھی ان افسانوں، کہانیوں اور خاکوں کو پڑھا اس کے دماغ کی چولیں ہل گئیں۔ اردو کے تن آسان انشاء پرداز مرزا پھویا قسم کے ادیبوں کے ہوش اڑ گئے، عشق پرست نازک مزاجوں کی صفوں میں زلزلہ آگیا۔ ان نفاست پسندوں میں منٹو ولین سمجھا گیا جس نے ان قحبہ خانوں کے جیتے جاگتے پس منظر میں سرمایہ داروں کے پلے لفنگے دلالوں کو دکھایا جس میں ہمیں تلذذ کے بجائے سب سے پہلے اس کے گھناؤنے پہلوؤں کا اندازہ ہوا۔ اور ہم نے خود کو بھی مجرم پایا۔ اس مصنف نے موپاساں کی طرح اس حیوانی ماحول میں گوشت پوست کے مجبور انسان کو دکھایا اور پورے معاشرے کو ماخوذ کر کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ سرمائے کی بازی گری کے پینترے سمجھائے۔ یہاں لکھنؤ کا پاکیزہ ڈیوڑھیوں کا ماحول یا لیلیٰ کے خطوط قسم کی مرزا چلتن مٹن والی 'آپ کے سر کی قسم' والی محبت نہیں تھی، طوائفوں سے علم و ادب، ادب و آداب، سیکھنے کا ڈھکوسلا نہیں تھا۔ یہاں مشینی زندگی میں ہنستے ہوئے عوام کی غیر جذباتی دو گھڑی کی موج تھی۔ پانی کا ایک دو گلاس بس۔ پہلی بار ہمیں محسوس ہوا کہ ہم واقعی ایک ذلیل معاشرے میں سانس لے رہے ہیں۔

میں نے بمبئی میں سب سے پہلی ادبی کتاب جو خریدی وہ 'منٹو کے افسانے' تھی۔ ۴۲/۱۹۴۰ء میں ساقی مرحوم میں 'چوہے دان' نے اس مصنف سے متعارف کرایا۔ پہلی بار مجھے اس کتاب کے ذریعے اردو کے افسانوں کی تازہ اور خنک ہوا ملی۔ دل میں خوشگوار لہر کا احساس کہ وہ ہمارے جذبات سے کتنا ہم آہنگ ہے۔

لکھنؤ، دہلی اور فتح پوری انشاء پردازی و عبارت آرائی کی گھٹن ان کی یکسانیت، رونے بسورنے والی کوفت بے عملی گھٹن۔ اب ایک نیا ادب منٹو کی ادبی جسارت سے پیدا ہوا۔ بمبئی کے ماحول میں ان کے الفاظ یا VOCABULARY اردو لغت میں اضافہ کر گئے کھولی، چال

نیا ادب منٹو کی ادبی جسارت سے پیدا ہوا

ڈیڑھیا مال پانی پاٹی والا سیٹھ دانده لفڑا ٹنٹنار ملوائی، منسی پالٹی کھاری سینگ والا موج شوک۔ وہی منٹو جس کے افسانے اول تو ایک ادبی پھلجڑی یا COMICUL INTERLUDE یا مزاحیہ چھیڑ سمجھ کر اہلِ زبان نے حرف گیری نہ کی بڑھتے بڑھتے اس عہد یا PERIOD کا لاجواب کلاسکی ادبی کارنامہ بن گیا، تو لوز لوترے کی پینٹنگس کی طرح وہ عوام کا مقبول ترین ادیب بن گیا۔

منٹو سے پہلے آنے والے اردو کے شعراء ادباء نے اپنی فرسودہ وضع بمبئی آکر بھی ترک نہ کی تھی۔ عطیہ فیضی کے مہمان مولانا شبلی نعمانی کو حافظ کی یہ پیروڈی سوجھی۔ ؎

کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

پارسی تھیٹر کے مکالمہ نگاروں میں جو لوگ آئے انہوں نے سب سے پہلے قلم سے روٹی روزی حاصل کی اور پھر تو ہر طرف سے اردو کے ادیب آنا شروع ہوئے۔ ان نوواردوں میں منٹو مرحوم سب سے منچلے، نڈر اور بے باک اہلِ قلم تھے جنہوں نے یہاں کی پرتعیش زندگی پر چڑھے ہوئے جھوٹے ملمعوں کو کھرچنا شروع کیا۔ رسالہ مصور کے ایڈیٹر اور امپیریل کمپنی کے منشی منٹو نے یہاں کی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا اور اس پر قلم اٹھایا۔ خواہ سیاسی ہو یا سماجی۔ اور حقیقت سے قریب کہانیوں کا جنم ہوا جس کا تتبع ہمارے درجنوں ادیبوں نے بشمول کرشن چندر و خواجہ احمد عباس نے کیا۔

دوسری جنگ عظیم، ہندو مسلم فساد، مزدوروں کی جد و جہد بمبئی کی ابھرتی فلمی صنعت سرمائے کی جھوٹی شان ایسے موضوعات پر ان کا قلم استادانہ مہارت و مشاقی سے چلتا ہے۔

امرتسر کی تنگ گلیوں اور غلیظ باڑوں سے بھاگ کر جب میں بمبئی پہنچا تو میرا خیال تھا کہ اس خوبصورت اور وسیع شہر کی فضا فرقہ وارانہ جھگڑوں سے پاک ہوگی مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ چند مہینوں کے بعد بمبئی میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا اور دیر تک جاری رہا۔ فساد کا وجہ موضوع تھا 'مندر مسجد' کئی آدمی اس فساد میں ہلاک ہوئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ افسوس ناک منظر دیکھے دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ پھر میں نے قلم اٹھایا اور امن کی اپیل اہالیان بمبئی کے نام شائع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو غیرت مند مسلمان مجھے مارنے کے لیے آئے۔ میں ان کی مار سے کیسے بچا یہ علیحدہ کہانی ہے۔ یہاں منٹو ایک گپ باز نہیں ایک سچے انسان دوست۔ ایک اصل REALIST ریفارمر اور مصلحِ قوم کی جون میں ابھرتا ہے۔ ان کی یہ اشک آلود اپیل اس جنون و دیوانگی کے سامنے ایک کروسیڈ تھی فرد واحد کی لیکن فرقہ پرستوں نے انہیں کو نشانہ بنانا چاہا۔

ان کے مضمون "باتیں" میں بھی اسی درد و کرب کی جھلکیاں ہیں جو ایک درد مند آرٹسٹ ہر دور میں محسوس کرتا ہے۔ بمبئی آیا تھا کہ چند روز پرانے دوستوں کے ساتھ گذاروں گا اور اپنے تھکے ہوئے دماغ کو آرام پہنچاؤں گا مگر یہاں آتے ہی وہ جھٹکے لگے کہ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ خیر صاحب بمبئی پہنچا۔ وہی بازار تھے وہی گلیاں جن کے پتھروں پر پانچ برس تک میرے نقشِ قدم بکھرتے رہے تھے۔ وہی بمبئی تھا جہاں میں ہندو مسلم فساد دیکھ چکا تھا۔ وہی خوبصورت شہر جس کے اندر میں نے کتنے ہی بے گناہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے خون کے چھینٹے اڑتے دیکھے تھے۔ وہی مقام تھا جہاں میں نے کئی دھوبیوں کو چوبارہ بارہ گھنٹے پانی میں کھڑے رہتے اور رات کو اپنے جسم میں گرمی پیدا کرنے کے لیے زہریلی اسپرٹ پیتے دیکھا۔ وہی عروس البلاد تھی جس کے گھونگھٹ کا ایک حصہ حریر کا ہے اور دوسرا موٹے کھردرے ٹاٹ کا! وہی بمبئی تھا جہاں اونچی اونچی خوبصورت عمارات کے قدموں میں فٹ پاتھ پر ہزارہا مخلوق رات کو سوتی ہے۔

پہلی دفعہ بمبئی دیکھنے پر نوجوان نووارد منٹو کے جذبات کچھ اس قسم کے تھے۔

"جب میں بمبئی گیا تو وہاں کی سڑکوں پر ان گنت لڑکیاں دیکھ کر میری طبیعت بہت خوش ہوئی کیونکہ ان میں اکثر اپنی کلائیوں پر گھڑی باندھتی تھیں۔

"ایک روز کا ذکر ہے کہ ناگپاڑہ کے جہاں یہودیوں کی آبادی ہے فٹ پاتھ پر میں نے ایک پارسی لڑکی دیکھی جو سامنے والے باٹلی ہسپتال کی طرف بڑھ رہی تھی۔"

ایک اور جگہ کردار کی زبان سے:

یہ بمبئی کی بات ہے میں اور میری سہیلی دونوں بس میں ماہم کا میلہ دیکھنے جا رہی تھیں موسم اچھا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم بالائی منزل پر تھیں۔ ہوا کے جھونکے خوب مزہ دے رہے تھے۔ جب بس دادر کے پل پر چڑھی تو ادھر ریلوے لائنوں کا ایک جال سا بکھرا نظر آیا۔ پھر جب کرافورڈ مارکیٹ کے پاس میں ایک دکان سے پستہ بھنا ہوا لے کر نکل رہی تھی کہ ایک خوش پوش نوجوان آیا!

مضمون 'چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد' میں لکھا ہے:

میں جس محلے میں رہتا ہوں وہاں کرسچین زیادہ آباد ہیں ہر رنگ کے کرسچین۔ سیاہ فام کرسچینوں سے لے کر گورے چٹے تک آپ کو تمام شیڈ یہاں مل جائیں گے۔ جامنی رنگ کے کرسچین بھی میں نے یہاں دیکھے جو خود کو ہندوستان کی فاتح قوم یعنی انگریزوں میں شمار کرتے ہیں۔

رسالہ 'مصوّر' کے دفتر کی رہائش چھوڑ کر وہ اس کے قریب ایک نہایت ذلیل چالی میں ۹ روپے ماہوار کی ایک کھولی میں رہا کرتے جس میں بقول ان کے 'اس قدر کھٹمل تھے کہ چھت سے وہ بارش کے قطروں

بڑی قبر کی کھدائی ایک روپے چار آنے، چھوٹی قبر کی کھدائی چودہ آنے

کی طرح گرتے'۔ اس دوران ان کی والدہ بھی امرتسر سے آگئیں جو اپنے بیٹے کو رات میں مٹی کے لیمپ کی روشنی میں قلم گھستے دیکھا کرتیں اور بیٹے کی غیر مستقل طبع اور عسرت کی زندگی پر آنسو بہاتیں۔

ان کا دلچسپ مضمون 'میری شادی'، منٹو کی بمبئی کی زندگی کا ایک ٹریجی کومیڈی یا الم دُرجا کی داستان ہے۔ اچانک شادی کے جھمیلے میں پھنسنے والے اس قلاش ادیب کو کس طرح اکیلے ہی بھاگ دوڑ کر کے اپنا گھر بسانا پڑا اور یہ شیر آغا حشر کی ڈرامائی زبان میں لوہے کے جال میں آگیا۔ کس طرح ان کی ماہم میں جعفر ہاؤس میں شادی ہوئی۔ باوجودیکہ انہوں نے اپنے خسر کو بدکانے کے سارے ذرائع استعمال کیے۔

نکاح قاضی مرگھے نے پڑھایا (عجیب نام ہے) شادی میں بمبئی کی اس دور کی شہرۂ آفاق ہستیاں شریک تھیں۔ بلی موریا کاردار، نور محمد چارلی، پدما دیوی، مرزا مشرف وغیرہ اُس نئے بتیس روپے ماہوار کے فلیٹ میں نئی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا جس کے متعلق منٹو لکھتے ہیں۔

"دوسرے دن میں نے خود کو چوتھائی شوہر محسوس کیا۔ باہر بالکنی میں ایک رسّی تنی نظر آنے لگی جس پر پوتڑے اور کلوٹ ٹنگے ہوئے تھے۔"

رخصتی سے پہلے وہ ہر اتوار کو ماہم جایا کرتے یہ سلسلہ دراز کرنے کی انہوں نے بہت کوشش کی۔ حالات کی تنگی ترشی کی وجہ سے اس دور کی ان کی بیچارگی اور بے بسی پر بے اختیار رحم آتا ہے۔ ان کے مضمون 'قبرستان' کا یہ ٹکڑا بھی خاصا دلچسپ و پُرمعنی ہے اور ان کی مخصوص شوخ نگاری کا غماز۔

"جب بمبئی میں میری والدہ کا انتقال ہوا میں چھوٹے چھوٹے نسبتاً غیر مہذب شہروں میں رہنے کا عادی تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ بڑے شہروں میں مُردوں پر بھی حکومت کی طرف سے پابندیاں عائد ہیں۔"

اس المناک حادثے پر ان کے قلم کی نمناک آنکھیں طنز و مزاح کے تیر چھوڑنے سے نہیں چوکتیں۔

"دو روپے رشوت کے طور پر ادا کرنے کے بعد میونسپلٹی کا سرٹیفیکیٹ حاصل کر لیا گیا۔ اب قبرستان کا دروازہ ہم پر کھلا تھا۔ لوہے کے بہت بڑے دروازے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جیسا کہ سینما کے ساتھ بکنگ آفس ہوتا ہے۔ اس کھڑکی سے ایک آدمی نے جھانک کر اندر جاتے ہوئے جنازے کو دیکھا اور کچھ کہنے کو تھا کہ میرے دوست نے وہ پرچی جو میونسپلٹی کے دفتر سے ملی تھی اس کے حوالے کر دی منیجر کو اطمینان ہو گیا کہ جنازہ بغیر ٹکٹ داخل نہیں ہوا۔"

پھر دوسری تفاصیل میں ضروری اطلاع کا بورڈ اس پر غسل وغیرہ کے نرخ کا اندراج سب منٹو کی ژرف نگاہی اور موضوع سے مکمل انصاف اس کے زبردست SENSE OF HUMOUR رنگ ظرافت کی دلیل ہیں۔ آخری پیراگراف میں منٹو نے بڑی بے دردی سے قلم کی درانتی چلائی ہے۔

"چند روز ہوئے مجھے پھر اسی قبرستان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نوٹس بورڈ پر ایک اعلان نامہ لکھا ہوا تھا۔ مؤرخہ ۸ جون ۱۹۴۲ء بوجہ گرانی قبر کی کھدائی کی مزدوری میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ بڑی قبر کی کھدائی ایک روپیہ چار آنے چھوٹی قبر کی کھدائی چودہ آنے، جنگ نے قبریں بھی مہنگی کر دی ہیں۔" کتنا کڑوا جملہ ہے، جنگ یعنی کشت و خون کے بازار ایک طرف اور شہریوں پر قبروں کی مہنگائی کا عذاب دوسری طرف۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری پر منٹو نے سب سے زیادہ اور سب سے اچھا اور بھرپور لکھا ہے۔ ان کے مضامین 'ہندوستانی صنعت فلم سازی پر ایک نظر'۔ 'شریف عورتیں اور فلمی دنیا' وغیرہ اس دور کے اجتہادی، تنقیدی مضامین ہیں جن میں کچھ تو آج بھی معنوی اعتبار سے بڑے وزن دار ہیں۔ جیسے نیو تھیٹرس کی فلم 'زندگی'، پر ان کا یادگار ریویو جس میں خواجہ احمد عباس اور جلیل انصاری کے حوالے دیے گئے ہیں جنہوں نے رائے دی تھی کہ زندگی بہت اچھی فلم ہے۔

منٹو لکھتے ہیں:

'میں بھی کہتا ہوں فلم بہت اچھا ہے۔ مگر میں زندگی دیکھنے گیا تھا زندگی۔ میرا خیال ہے جلیل انصاری اس کا مطلب بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔ ہال میں اندھیرا ہوا اور زندگی شروع ہوئی تو مجھے اس کی رفتار دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ شراب خانے کے ویٹر نے تند و تیز شراب کے بجائے غلطی سے میرے ہاتھ میں سکنجبین کا گلاس تھما دیا ہے۔'

افسانوی شخصیت

ان کے قلمی خاکوں میں پری چہرہ نسیم، اشوک کمار، کلدیپ کور، شیام کور وغیرہ ہیں۔ ان میں دور کے صفِ اول کے اداکاروں سے صرف ان کی شناسائی نہیں بلکہ ان کے ہر درونِ خانہ راز ان کے نوکِ قلم پر آجاتے ہیں۔ فرضی کرداروں میں بابو گوپی ناتھ یا جناح کا ڈرائیور یا جھیا کی بیٹی وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن کے ساتھ ساتھ حقیقت بھی ہمرکاب ہے۔ بعد میں کرشن چندر نے بڑی خوبی سے دلیپ کمار کے ناؤ میں دکھایا کہ مشاہیر کے نام سے کیسے گھپلے کیے جاتے ہیں۔

منٹو کے لیے بمبئی میں فلم انڈسٹری کا رنگین ماحول سازگار تھا مگر

دیکھو بھئی! یہاں مت آؤ، یہاں سے پاکستان شروع ہوتا ہے

ملکی حالات اور تقسیم ہند کے فسادات کے لامتناہی شب و روز ان کے لیے سوہانِ روح بنے۔ ہر سچا فن کار روز نئے تیروں سے زخمی ہوتا ہے منٹو نے تقسیم کے بعد ان المناک واقعات کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔ ان کے قلم نے ان واقعات پر جو خون افشانیاں کی ہیں وہ کسی دوسرے ادیب کی تحریر میں اتنی شدت سے نہیں ملتیں۔

بمبئی سے لاہور تک فسادات وغیرہ انسانی سلوک۔ وہ درندگی وہ خون آشامی کے واقعات جنہوں نے نفاست پسند منٹو کی نیندیں حرام کر دیں۔ بمبئی سے جانے کے بعد ان کی تحریروں میں تقسیم ہند کا موضوع نمایاں ہے۔ بعد کی ساری تحریریں خوں چکاں ہیں، جلے دماغوں کو چٹخا دینے والے، دھماکہ خیز 'خوشبو' اور 'شو شو' کی شوخ رومان بھری تحریریں لکھنے والے ادیب کے قلم سے اب گالیاں نکل رہی تھیں، ان غنڈوں اور بدمعاشوں کے لیے جو فرقہ وارانہ فسادات کے دوران انسان کی عصمت و عفت کی دھجیاں بکھیر رہے تھے۔ مذہب کے نام پر جنہوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اپنے پرائے کی تمیز بھی جن میں باقی نہ رہی۔ اب وہ قلم مصلوب ہو گیا تھا۔ اس کے ہر موضوع میں کڑوے زہر بھرے جملے تھے۔ ہر جگہ خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اب اسے قاری کی پروا نہ تھی کیونکہ خود قاری اس کھنڈر عمارت میں اس کے ان زندہ جملوں میں ان زندہ جملوں کو ڈھونڈنے اور انہیں گلے لگانے کے لیے بے تاب تھا۔

ماہم اور بھنڈی بازار کے دو علاقوں پر کس خوبی سے لکھا ہے۔

"ماہم کی طرف ایک لمبی سڑک جاتی ہے۔ سڑک کے آخری سرے پر مسلمانوں کی ایک مشہور خانقاہ ہے مسلمان مردہ پرست مشہور ہیں۔ جب بلوا شروع ہوا اور شہر کے اس حصے پر پہنچ گیا تو ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ چند ہندو لڑکے لوہے کا ایک جنگلہ گھسیٹ کر اس طرف لے جانے لگے، جدھر خانقاہ ہے۔ چند مسلمان آگے بڑھے ان میں سے ایک نے آہستگی سے ان لڑکوں سے کہا: 'دیکھو بھئی! ادھر مت آؤ یہاں سے پاکستان شروع ہوتا ہے، سڑک پر ایک لکیر کھینچ دی گئی۔ چنانچہ بلوا پسند لڑکے چپ چاپ اس جنگلے کو اٹھا کر دوسری طرف لے گئے۔ کہتے ہیں پاکستان کی طرف پھر کسی 'کافر' نے رخ نہیں کیا۔"

بھنڈی بازار کا ایک تذکرہ یوں کیا ہے:

"بھنڈی بازار مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ وہاں کوئی شورش نہیں ہوئی، مسلمان۔ وہ مسلمان جو ہندو مسلم فساد میں پیش پیش رہتے ہیں، اب ہوٹلوں میں چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر شادی کی باتیں کرتے ہیں اور ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ میں نے ایک مسلمان کو اپنے دوست سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہمارے جناح صاحب دیکھیے ہمیں کب آرڈر دیتے ہیں۔"

غضب کے نشتر ان کی رواں تحریروں میں چھپے ملتے ہیں۔

یہیں ہمیں کرشن چندر کے اس لاجواب فقرے کا لطف اور اس کی چوٹ محسوس ہوتی ہے کہ منٹو اردو ادب کا واحد شنکر ہے، جس نے زندگی کی ساری تلخیوں کو گھول کر پی لیا ہے۔ ایسی تلخی کڑواہٹ جو منٹو کا مقدر بھی انہی تلخیوں کے سہارے وہ جیا (ساحر کی طرح) اور انہی میں گھل کر تحلیل ہو گیا۔

منٹو بھائی — آگل لاستہ نہیں ملے گا موٹر روک لو اور ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ، اور میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔

منٹو نے بمبئی چھوڑ دیا جس کے متعلق اس نے اپنے دوست ابو سعید قریشی کو خط میں لکھا تھا۔

"یہاں آؤ اور دیکھو زندگی سے کندھا رگڑنے میں کتنا مزہ ہے۔"

بمبئی میں منٹو نے ان ادبی رفعتوں کو حاصل کیا جو امرتسر دہلی یا لاہور میں کہاں نصیب ہوتیں۔ بمبئی نے منٹو کے ذہن کو صیقل کیا۔ اس کے فن کی قدر کی، یہاں اسے عروج ملا۔

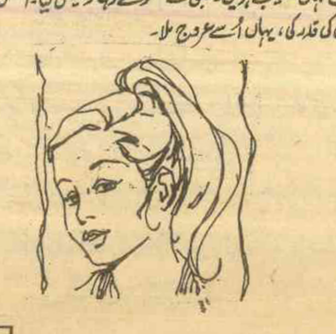

تھیوکریسی

"ہم کس چیز کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہم تھیوکریسی کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں نہ ہمارا نصب العین تھیوکریٹک ریاست قائم کرنا ہے" (مسٹر جناح کا خطبہ مسلم لیگی ممبران اسمبلی کے کنونشن میں۔ ۱۹۴۶ء دہلی)

"بہرصورت پاکستان تھیوکریٹک ریاست نہیں ہونے والا ہے جہاں ملّاؤں کی حکومت ہو جن کا خیال ہے کہ اُن کو اُلوہی فریضہ سونپا گیا ہے"۔

قائداعظم محمد علی جناح فروری ۱۹۴۸ء

سیّد سبطِ حسن

تھیوکریسی ریاست کی وہ قسم ہے جس میں حکومت کے قوانین احکامِ خداوندی سے منسوب کئے جاتے ہوں یا جہاں کا حاکمِ اعلیٰ خدا یا خدا کے اوتار یا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں تھیوکریسی وہ ریاست ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ملک کے باشندے نہ ہوں اور نہ عنانِ اختیار اُن کے چُنے ہوئے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو بلکہ سربراہِ مملکت کسی دوسرے ذریعہ سے اقتدار حاصل کر کے احکامِ خداوندی کی ترجمانی کا مدعی ہو۔

لیکن تھیوکریسی، ملوکیت اور جمہوریت ریاست ہی کی مختلف قسمیں ہیں لہٰذا تھیوکریسی کی تفصیلات پر غور کرنے سے پیشتر ریاست کی نوعیت کی وضاحت ضروری ہے کیونکہ جب سے پاکستان اور ایران میں اسلامی ریاست کا غلغلہ بلند ہوا ہے بعض حلقے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مُشرّف بہ اسلام ہوتے ہی ریاست کی فطرت بدل جاتی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ہم سوچیں کہ کوئی مسیحی مسلمان ہوتے ہی آنکھوں کے بجائے کانوں سے دیکھنے لگے گا یا پاؤں کے بجائے سر کے بَل چلنے لگے گا۔

ریاست کسی خود مختار علاقے کی سب سے مقتدر سیاسی تنظیم ہے جو علاقے کی آبادی کو مختلف قاہرانہ اور نظریاتی ذرائع سے اپنے احکام کا پابند بناتی ہے۔ ریاست ازل سے موجود نہیں ہے اور نہ آسمان سے اُتری ہے۔ وہ اِنسانوں ہی کا بنایا ہوا سماجی ادارہ ہے جس کی تشکیل ایک دن میں کسی کے حکم سے نہیں ہوئی بلکہ جس نے گذشتہ چھ ہزار برس میں ارتقا کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ ریاست دراصل اُس وقت وجود میں آئی جب معاشرہ طبقوں میں بٹ گیا اور دولت آفرینی کے ذرائع (زمین، زمین کی پیداوار اور آلات پیداوار وغیرہ) چند افراد کی ذاتی ملکیت بن گئے۔ ریاست انسانوں کی پہلی با اختیار معاشرتی تنظیم بھی نہیں چنانچہ خاندان، گھرانے، برادریاں اور قبیلے ریاست سے لاکھوں برس پیشتر موجود تھے۔ اُن کے اُصول اور ضابطے بھی تھے جن کو معاشرتی ضرورتوں نے رواج دیا تھا۔ رواج کے مطابق خاندان کا بزرگ، قبیلے کا سردار اور گاؤں کا مکھیا سب سے مقتدر شخص ہوتا تھا۔ حاکمیت کا مرکز بھی رواج ہی تھا جس کی حیثیت ہر چند کہ اخلاقی تھی مگر جمعیت کے ہر فرد کو رواج کی حاکمیت تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً آنحضرت صلعم کے عہد میں مکے اور مدینے میں قبیلہ داری نظام رائج تھا مگر ریاست نہ تھی۔ مدینے میں قبیلے الگ الگ چہار دیواریوں میں رہتے تھے اور ہر قبیلہ اندرونی نظم و نسق کا خود ذمہ دار ہوتا تھا۔ پورے شہر کی کوئی با اختیار

مرکزی تنظیم نہ تھی۔ مکّے میں بھی جو مذہبی اور تجارتی اعتبار سے نہایت اہم شہر تھا۔ قبیلے جدا جدا خود مختار وحدتیں تھیں البتہ قبیلوں کے سرداروں کی ایک ڈھیلی ڈھالی تنظیم ضرور موجود تھی جس نے حج اور تجارت کے فرائض آپس میں تقسیم کر لئے تھے۔ جنگ کے موقع پر کسی موزوں شخص کو لشکر کا سالار چن لیا جاتا تھا۔ شہر کی حفاظت کے لئے کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی بلکہ شہر کا دفاع ہر بالغ اور تندرست شخص کا فرض تھا۔

ان پُرانی تنظیموں میں اور ریاست کے درمیان یہ فرق بھی ہے کہ پُرانی تنظیموں کی وحدت کی بنیاد خونی رشتے، مذہبی عقاید اور زبان کی یکسانیت پر تھی کسی مخصوص علاقے سے وابستگی شرط نہ تھی۔ (بدوی قبیلے تو صحرانورد تھے) جب کہ ریاست ایک علاقائی یا جغرافیو سیاسی وحدت ہے جو خونی رشتوں سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اُس کے حدود میں ایک سے زائد قبیلوں، قوموں، زبانوں اور مذہبوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ خاندان، برادریاں، قبیلے اور گاؤں کی پُرانی تنظیمیں طبقوں میں بٹی ہوئی نہیں تھیں۔ اُن میں نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی محکوم۔ اس کے برعکس ریاست کی نوعیت ابتدا ہی سے طبقاتی رہی ہے۔ وہ معاشرے کے طبقات میں بٹ جانے ہی کی وجہ سے وجود میں آئی اور اُس کا منصب ہی یہ ہے کہ حاکم طبقے کی بالادستی کا بچاؤ کیا جائے۔ غرضیکہ ریاست خواہ وہ تھیوکریسی ہو، یا بادشاہت، جمہوری ہو، یا اشتراکی بنیادی طور پر طبقاتی ادارہ ہے۔ تھیوکریسی مذہبی پیشواؤں کے اقتدار و مفاد کا تحفظ کرتی تھی، ملوکیت کا فریضہ بادشاہ اور شاہی خاندان کے اقتدار کو قائم رکھنا تھا۔ بورژوا جمہوریتیں سرمایہ دار طبقے کی محافظ و معین ہوتی ہیں۔ سوشلسٹ ریاستیں محنت کش طبقوں کے مفاد کا تحفظ کرتی ہیں۔

"ریاست ہرگز کوئی ایسی طاقت نہیں جو سوسائٹی پر اوپر سے تھوپی گئی ہو..... بلکہ وہ سوسائٹی ہی کی پیداوار ہے جو معاشرتی ارتقا کی ایک خاص منزل پر نمودار ہوتی ہے۔ اُس کا وجود اس بات کا اقرار ہے کہ سوسائٹی اب ناقابل حل تضاد میں اُلجھ گئی ہے اور اُس کے اندر ایسی مخاصمتیں پیدا ہو گئی ہیں جن کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا اور نہ سوسائٹی ان دشمنیوں کو دور کر سکتی ہے لیکن مبادا یہ مخاصمتیں، یہ طبقے جن کے اقتصادی مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں، بے سود کشمکش سے اپنے آپ کو اور سوسائٹی کو جلا کر خاک کر دیں ایک ایسی طاقت کی ضرورت پیش آتی ہے جو بہ ظاہر سوسائٹی سے بلند و بالا ہو تاکہ تصادم میں اعتدال قائم ہو سکے اور باہمی ٹکر کو "نظم و ضبط" کی حدوں میں رکھا جا سکے۔ یہ طاقت جو سوسائٹی کے اندر سے اُبھرتی ہے لیکن اپنے کو سوسائٹی سے بالا رکھتی ہے اور سوسائٹی سے مسلسل بیگانہ ہوتی جاتی ہے ریاست ہے۔"[1]

ابتدائی ریاستیں شہری ریاستیں تھیں جو سب سے پہلے دھات کے زمانے میں دریاؤں کے کنارے قائم ہوئیں۔ دھات کے آلات و اوزار کے رواج پانے سے دیہات کی فاضل پیداوار میں اضافہ ہوا، پیداوار میں اضافے کی وجہ سے پیشوں کی تقسیم اور تجارت کی ابتدا ہوئی اور منڈیوں بازاروں اور شہروں کا قیام عمل میں آیا۔ ان شہروں کا مرکز کوئی نہ کوئی عبادت گاہ ہوتی تھی جس نے ریاست کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ نہری آبپاشی کا بندوبست، علاقائی جنگیں اور غلامی کے رواج نے بھی ریاست کی تشکیل میں بڑی مدد دی۔

ابتدائی ریاستیں تھیوکریسی یعنی مذہبی ریاستیں تھیں خواہ وہ وادیٔ نیل اور وادیٔ دجلہ و فرات کی ہوں یا وادیٔ سندھ اور وادیٔ گنگ و جمن کی۔ وجہ یہ تھی کہ بڑی بڑی عبادت گاہیں اپنے گرد و نواح کی سب سے با اثر اور دولت مند طاقت ہوتی تھیں۔ عبادت گاہ میں جس

دیوی دیوتا کی پوجا ہوتی تھی بستی اُسی کے نام سے منسوب کر دی جاتی تھی بلکہ اُسی دیوتا کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً بالائی مصر کا دارالحکومت تھیبز خداوند آمون رع کی ملکیت تھا اور زیرین مصر کا صدر مقام ممفس بیل دیوتا کی ملکیت تھا۔ اسی طرح جنوبی عراق میں اریدو کا شہر میٹھے پانی کے دیوتا اِنکی، اریک سب سے بڑے دیوتا انو، نیفر ہوا کے دیوتا اِن لیل اور اُر چاند دیوتا ننّا کی ملکیت تھے۔ جاتریوں کی آمد و رفت بڑھی تو بنئے بقال، بیوپاری، دوکاندار اور دوسرے پیشوں کے لوگ وہاں آ کر آباد ہونے لگے اور یہ جگہیں رفتہ رفتہ پہلے شہر پھر شہری ریاستوں کا صدر مقام بن گئیں۔ اِن شہری ریاستوں کے سربراہ معبدوں کے مہا پروہت ہوتے تھے۔ جو زمین پر آسمانی دیوتاؤں کے نمائندے خیال کئے جاتے تھے اور جن کے احکام دیوتاؤں کے احکام کا درجہ رکھتے تھے۔ سومیری زبان میں ریاست کے سربراہ کو "پتیسی" PATES I کہتے تھے۔ جس کے لفظی معنی "پروہت راجہ" کے ہوتے ہیں۔ اور قدیم مصری زبان میں "خدا" اور "بادشاہ" دونوں کے لئے "ہورس" کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ پروہت راجاؤں کی دولت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنوبی عراق کے آثار قدیمہ کی کھدائی میں اب تک مٹی کی جتنی لوحیں نکلی ہیں (۲ ۱/۲ لاکھ) اُن میں سے ۹۵ فیصدی لوحیں معبدوں کے حساب کتاب سے متعلق ہیں۔ فقط پانچ فیصد ایسی ہیں جن پر اشلوک، گیت، بھجن اور داستانیں لکھی ہیں۔

پروہت راج میں ریاست کے سربراہ کو دوہرے فرائض سرانجام دینے پڑتے تھے۔ وہ مذہبی پیشوا بھی ہوتا تھا اور ریاست کے نظم و نسق کا نگران اعلیٰ بھی۔ مذہبی اُمور کی حد تک اُس کے اختیارات لامحدود تھے کیونکہ وہ زمین پر اپنے رب کا نائب تسلیم کیا جاتا تھا اور اُسی کے رُوبرو جواب دہ تھا لیکن ریاستی اُمور میں اُس کو مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ یہ مجلسِ شوریٰ عمائدینِ شہر کی نمائندہ تنظیم ہوتی تھی جس کو پاکستان کی نام نہاد مجلسِ شوریٰ کی مانند ریاست کا سربراہ نامزد نہیں کرتا تھا۔ نہروں اور تجارتی راستوں کی دیکھ بھال کرنا، ریاست کے اندر امن و امان برقرار رکھنا، شہریوں کے آپس کے جھگڑے چکانا اور مقدموں کا تصفیہ کرنا مجلسِ شوریٰ کے فرائض میں داخل تھا۔ مجلسِ شوریٰ کے علاوہ بزرگانِ شہر کی ایک مجلسِ اعلیٰ بھی ہوتی تھی۔ ان دونوں "ایوانوں" میں فیصلے کثرتِ رائے سے نہیں بلکہ اتفاقِ رائے سے ہوتے تھے جو قبیلہ واری نظام کی دیرینہ روایت ہے۔

مگر دُہرے فرائض اور محدود جمہوریت کا ریاستی نظام زیادہ دن نہ چل سکا۔ کیونکہ شہری ریاستیں اپنے دائرہ اثر کو وسعت دینے اور اپنے ذرائع دولت آفرینی میں اضافہ کرنے کی خاطر بیشتر اوقات ایک دوسرے پر حملے کرتی رہتی تھیں۔ یہ صورتِ حال شخصی حکومت کے قیام کے حق میں بہت مددگار ثابت ہوئی۔ جنگ کے موقع پر چونکہ تمام اختیارات لامحالہ سالار فوج کے سپرد کرنے پڑتے تھے لہٰذا وہ سیاسی طاقت کا مرکز بن جاتا تھا۔ سومیری زبان میں اس شخص کو "لوگل" یعنی بڑا آدمی کہتے تھے۔ ابتدا میں لوگل کا عہدہ "باندہ" یعنی عارضی ہوتا تھا اور جنگ کے ہنگامی حالات گذر جانے پر تمام اختیارات مجلسِ شوریٰ کو منتقل کر دئے جاتے تھے۔ مگر ہنگامی حالات کے خاتمے کا فیصلہ لوگل باندہ ہی کرتا تھا چنانچہ ہنگامی حالات رفتہ رفتہ عارضی سے مستقل ہونے لگے کیونکہ لوگل باندہ کا فائدہ اسی میں تھا۔ بالآخر فوجی طاقت کے مالک ریاست کے سربراہ بن گئے۔ البتہ مجلسِ شوریٰ کا نظام شخصی حکومتوں کے قیام کے بعد بھی عرصے تک باقی رہا۔ مثلاً گل گامش کی داستان میں گل گامش کے اس طرزِ عمل پر اعتراض کیا گیا ہے کہ

۱ـ 1. Frederick Engels : Anti-Duhring . P 247.

وہ مجلس شوریٰ کو خاطر میں نہیں لاتا۔

"گل گامش ایوان شوریٰ میں زبردستی گھس آیا ہے حالانکہ یہ عمارت شہریوں کی ملکیت ہے"۔

اس فقرے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مجلسِ شوریٰ کی اپنی عمارت ہوتی تھی اور حاکم وقت بھی اس میں مجلس کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ایوان کے کاموں میں مداخلت کر سکتا تھا۔ لیکن بادشاہوں کی طاقت جب مستحکم ہو گئی تو مجلس شوریٰ کا ادارہ قدرتی موت مر گیا۔ بادشاہ شہریوں کے نمائندوں کے بجائے اپنے نامزد کردہ وزیروں اور درباریوں سے صلاح مشورے کرنے لگے۔

ملوکیت کے اس ابتدائی دور میں بادشاہ اقتدار اعلیٰ کا مالک ضرور تھا لیکن مقننہ اور عدلیہ کے اختیارات بدستور پروہت طبقے کے پاس رہے۔ پروہت طبقہ مذہبی احکام کے مطابق قانون بناتا۔ اور یہ تصفیہ کرتا کہ مذہب کی رُو سے کون سا فعل جائز ہے اور کون سا ناجائز، مذہب نے کس جرم کی کیا سزا مقرر کی ہے اور رعایا کے کون کون سے فرائض متعین کئے ہیں۔ اس تقسیم کار کی بدولت بادشاہوں کو ریاست کے نہایت اہم طبقے کا تعاون ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ اُن کے اقتدار کو مذہبی جواز بھی مل گیا۔

بادشاہوں نے ریاست پر قابض ہونے کے بعد عبادت گاہوں کے وقار پر حرف نہ آنے دیا۔ نہ اُن کی املاک ضبط کیں اور نہ عبادت گاہوں کے نظم و نسق میں کوئی مداخلت کی۔ بلکہ اُن کو مزید انعام و اکرام سے نوازا۔ عبادت گاہ کی مرمت میں شرکت ہر شخص کا مذہبی فریضہ تصور کی جاتی تھی۔ اس رسم کی ابتدا بادشاہ کرتا تھا چنانچہ بابل سومیر اور اسور کے قدیم آثار سے ایسی لوحیں برآمد ہوئی ہیں جن میں بادشاہ کو سر پر ٹوکری رکھے مرمت کے کام میں مصروف دکھایا گیا ہے۔

پروہتوں نے بھی نئی تقسیم کار کو خوشی قبول کر لیا۔ انہوں نے بادشاہوں سے پورا پورا تعاون کیا اور اُن کو خدا، خدا کا اوتار، خدا کا نائب بنا دیا۔ بادشاہ کی شخصیت کے گرد تقدس کا جو ہالہ ان پروہتوں نے چھ ہزار برس پہلے کھینچا تھا ملوکیت کے زوال تک مشرق اور مغرب میں تھوڑے تھوڑے فرق سے ہر جگہ بدستور قائم رہا۔ چنانچہ اسلامی دور میں بھی بادشاہوں کو ظلِ اللہ (خدا کا سایہ) کا لقب ملا۔ قاضی ماوردی نے "احکام السلطانیہ" میں، امام غزالی نے نصیحت الملوک میں، نظام الملک طوسی نے "سیاست نامے" میں ابونصر فارابی نے "الآراء مدینۃ الفاضلہ" میں اور ابن خلدون نے "تاریخ" میں اطیعو اللہ اطیعو الرسول اور اولی الامر منکم کی غلط اور غیر تاریخی تفسیر کی آڑ میں حاکم وقت کی اطاعت کا جو سبق مسلمانوں کو دیا وہ غیر مسلم مذہبی پیشواؤں کی تلقینوں سے چنداں مختلف نہیں۔

پُرانے زمانے میں ریاستوں کے وسائل اتنے وافر نہیں تھے کہ وہ تنخواہ یافتہ فوج اور پولیس ملازم رکھ کر رعایا کو اپنے احکام کی پابندی پر مجبور کر سکتیں۔ رسل و رسائل اور آمد و رفت کی سہولتیں بھی بہت کم تھیں لہٰذا شاہی احکام کے نفاذ میں رکاوٹیں پیش آتی تھیں اور ریاست اپنی قوت قاہرہ سے خاطر خواہ کام نہیں لے سکتی تھی۔ حالاتِ زندگی کی ان دشواریوں کا تقاضہ تھا کہ ایسے نظریے رائج کئے جائیں جن کی بدولت لوگوں کے دل و دماغ ریاست کے احکام و قوانین کی پابندی کے خوگر ہو جائیں اور اطاعت و فرماں برداری اُن کی سرشت بن جائے۔ اس روایت پر آج بھی ہر جگہ عمل ہو رہا ہے چنانچہ دنیا میں ایسی کوئی ریاست نہیں جس کا کوئی نظریہ نہ ہو۔ نظریاتی ریاست ہونا پاکستان کی انفرادی خصوصیت نہیں۔

ریاستوں کے تشکیلی دور میں عقاید و افکار کی اجارہ داری مذہبی پیشواؤں کو حاصل تھی اور لوگوں کے ذہنوں پر انہیں کی حکومت تھی لہٰذا ریاست کے ابتدائی نظریوں پر مذہب کی چھاپ پڑنا قدرتی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بابل، مصر، ایران، یونان، فلسطین، ہندوستان اور چین ہر ملک میں ریاست کو عطیہ خداوندی قرار دیا گیا، حاکم وقت کو خدا، خدا کا اوتار یا نمائندہ بنا دیا گیا اور ریاست کے احکام و قوانین کو فرمانِ الٰہی سے منسوب کر دیا گیا۔

شہری ریاست اِریک (جنوبی عراق) کے بادشاہ اُتو ہیگل (۲۱۲۰ - ۲۱۱۴ ق-م) نے تو اُن بادشاہتوں کی باقاعدہ فہرست مرتب کروائی جو دجلہ و فرات کی وادی میں "آسمان سے اُتری تھیں"۔ اس فہرست شاہاں کے مطابق "آسمان سے پہلی بادشاہت اریدو میں اُتاری گئی، جو سومیری قوم کا سب سے قدیم شہر تھا" یہ بادشاہت ۶۴ ہزار ۸ سو برس تک قائم رہی" اور اس طویل عرصے میں فقط دو بادشاہ ہوئے! پھر کسی نامعلوم سبب سے بادشاہت شہر باد طبریٰ میں منتقل ہو گئی۔ وہاں سے لہرک، پھر سیپر اور آخر میں شروپک پہنچی اور "تب زمین پر سیلاب آ گیا"۔

سیلاب عظیم کے بعد "بادشاہت دوبارہ آسمان سے اُتاری گئی" لیکن اب کے شہر کیش میں۔ وہاں ۲۳ بادشاہوں نے ۲۴ ۲/۱ ہزار برس تک حکومت کی "تب کیش کو جنگی ہتھیاروں نے کاٹ کھایا" اور بادشاہت اِیانا (اریک کا مقدس معبد) کو منتقل ہو گئی۔ اریک کا پہلا بادشاہ میس کیاگ گاشر تھا جو خداوند اُتو (سورج) کا بیٹا تھا۔ وہ مندر کا مہا پروہت بھی تھا اور بادشاہ بھی"۔ اُتو ہیگل صاحب جنھوں نے یہ فہرست شاہاں مرتب کروائی تھی اسی کی اولاد تھے![3]

تھیوکریسی میں قانون بھی عالم بالا سے نازل ہوتے تھے اور اُن کو مقدس اور واجب تعظیم بنانے کے لئے خدا کا نام بڑی کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ مثلاً فرعون اول منیز (۳۴۰۰ ق-م) نے جب بالائی اور زیریں مصر کو ملا کر اپنی سلطنت قائم کی اور پہلا قانون نافذ کیا تو یہی دعویٰ کیا کہ یہ ضابطہ "قانون مجھ کو خداوند قمر (توتھ) نے عطا کیا ہے"۔ منیز کے جانشینوں نے اس پر اکتفا نہ کی بلکہ خدائی اختیارات خود سنبھال لئے۔ وہ ربِّ عظیم آمون رع (سورج) کے بیٹے بن گئے۔ اس ناتے وہ مصریوں کے مذہبی پیشوا بھی تھے اور ریاست کے سربراہ بھی۔

خدائی قوانین کے نزول کا طریقہ بھی قریب قریب یکساں تھا۔ عالم بالا تک رسائی ممکن نہ تھی لہٰذا پہاڑ کی بلندی عالم بالا کی علامت ٹھہری اور بادشاہوں کو احکام خداوندی پہاڑ کی چوٹیوں پر عطا ہونے لگے۔ مثلاً شہنشاہ حمورابی (۱۷۹۲ - ۱۷۵۰ ق-م) کے آئین کی جو کندہ شدہ لاٹ پیرس کے عجائب گھر لوور میں محفوظ ہے اُس کے بالائی منظر میں خداوند شمس پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا حمورابی کو آئین کا طومار عطا کر رہا ہے۔ واضح رہے کہ حمورابی کا آئین دنیا کا سب سے پہلا تحریری آئین ہے۔ آئین کے تمہیدی فقرے یہ ہیں:

ص قدیم شہری ریاستوں پر ہم نے اپنی کتاب "ماضی کے مزار" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

[3] Will Durant : Our Oriental Heritage, Vol. I, P. 147, 201

"جس وقت ربِ عظیم انوم اور زمین و آسمان کے آقا اِن لیل نے جو سب کی تقدیروں کا متعین کرنے والا ہے مردوک کو تمام بنی نوع انسان کا حاکم مقرر کیا اور بابل کو اُس کے عظیم نام سے پکارا اور اُس کو دنیا میں سب پر فضیلت بخشی اور اُس کے وسط میں ایک مضبوط بادشاہت قائم کی۔ اُسی وقت انوم اور اِن لیل نے مجھے نامزد کیا۔ میں حمورابی ہوں۔ آقا مردوک جس سے خوش ہے۔ جس کے کارنامے عشتار دیوی کو پسند ہیں۔ جو قانون کا حکم منوانا ہے۔ جب مردوک نے مجھ کو ہدایت کی کہ اپنی رعایا کو راہ راست پر لے چلوں اور ملک کی نگرانی کروں تو میں نے ملک کی زبان میں قانون اور انصاف رائج کیا۔"

روایت کے مطابق جزیرہ کریٹ کے بادشاہ مینوس MINOS کو بھی خداوند زیوس نے قانون کی لوحیں کوہِ دکتا پر عطا کی تھیں۔ اور یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ قانون کے دیوتا دایونائی سس DIONYSUS نے قانون کو پتھر کی دو تختیوں پر کندہ کروا کر زمین پر اُتارا۔ اور ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ زرتشت نبی نے پہاڑ پر جا کر خداوند اہورمزدا سے التجا کی۔ "تب بجلی چمکی، آسمان گرجا اور اہورمزدا نے پہاڑ پر اُتر کر "کتاب قوانین" زرتشت کے حوالے کی۔" حضرت موسیٰ کے ساتھ بھی یہی حادثہ گزرا:

"اور خداوند کوہ سینا کی چوٹی پر اُترا اور خداوند نے موسیٰ کو پہاڑ کی چوٹی پر بلایا اور کہا کہ میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام جو میں نے لکھے ہیں دوں گا تاکہ تو اُن کو سکھائے۔"

(کتاب خروج۔ باب ۲۴ : ۱۲)

اسی طرح داریوش اعظم (۵۲۲ - ۴۸۶ ق-م) اپنے ایک فرمان میں جو نقش رستم کی پہاڑی پر کندہ ہے اعلان کرتا ہے کہ

"خدائے عظیم اہورمزدا کے نام سے جس نے یہ زمین خلق کی اور آسمان بھی، جس نے انسانوں کو پیدا کیا اور اُن کے لئے خوشیوں کو اور جس نے داریوش کو بادشاہ بنایا، بہت سے بادشاہوں کا بادشاہ اور بہتوں کا آقا۔ وہی ہے جس نے اس وسیع اقلیم کی شاہی جس میں بہت سی قومیں آباد ہیں داریوش کو بخشی۔"

یونان کی ریاست اسپارٹا میں بھی آئین آسمان ہی سے نازل ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ مشہور قانون داں لائی کرگس (آٹھویں صدی قبل مسیح) آئین سازی پر مامور ہوا تو وہ ڈیلفی گیا جو یونان کی سب سے مقدس عبادت گاہ اور غیب دانی کا مرکز تھا۔ واپس آکر اُس نے اعلان کیا کہ آئین کی دفعات مجھ پر غیب سے الہام ہوئی ہیں۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ آئین نافذ کرتے وقت لائی کرگس نے اسپارٹا والوں سے عہد لیا تھا کہ میری واپسی تک تم لوگ آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کرو گے۔ یہ عہد لے کر لائی کرگس ڈیلفی چلا گیا مگر کبھی نہ لوٹا۔

ملوکیت کے الوہی استحقاق میں ہندوستان، چین اور جاپان مشرقِ وسطیٰ سے پیچھے نہیں رہے۔ چنانچہ منوسمرتی کے مطابق جو بعض مورخین کی رائے میں چوتھی صدی قبل مسیح سے پہلے کی تصنیف ہے ریاست کے سربراہ کا رتبہ دیوتا کے برابر ہے۔

"بھگوان نے راجپتی کو سب جیو کی رکشا کے لئے جنم دیا۔ وہ اِندرا، وایو (ہوا) یم (موت) سوریہ (سورج) اگنی، ورونا، چندرما اور کوبیر (دولت کا دیوتا) کے ابدی ذرات کا آمیزہ ہے۔ وہ منوش کے روپ میں مہادیو ہے۔ پس خبردار! کوئی شخص راجہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرے خواہ اِن احکام کا تعلق انعام سے ہو یا سزا اور خفگی سے۔"[4]

منوسمرتی ریاست کی قوت قاہرہ پر بالکل پردہ نہیں ڈالتا بلکہ سزا کو بھی مقدس عمل سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ "ڈنڈا برہما دیوتا کا بیٹا ہے اور تمام مخلوق کا محافظ۔ عقلمندوں کے نزدیک قانون اور ڈنڈا ہم معنی الفاظ ہیں۔"[5]

چین کے فرماں روا بھی "آسمان کی اولاد" T'IEN TSE کہلاتے تھے اور زمین پر خدائے عرش کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ ریاست کے سربراہ اور مذہب کے پیشوا بھی ہوتے تھے۔ اُن کے ہر حکم کو احکام خدائی کا درجہ حاصل تھا اور اُن کا فیصلہ خدا کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ کو اگر جنگ میں شکست ہو جاتی یا قحط پڑ جاتا یا کوئی دشمن اُس کو تخت سے اُتار دیتا تو تاویل یہ کی جاتی تھی کہ خدا نے اُس کو اپنی خلافت سے محروم کر دیا ہے۔[6] خدا کی یہ خود ساختہ اولاد ۱۹۱۱ء تک انہیں لغو دعووں کے ساتھ چین پر حکومت کرتی رہی اور تب وہاں جمہوری انقلاب آیا اور اس آسمانی بادشاہت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

جاپان میں ۱۹۴۵ء تک یہی صورت رہی۔ وہاں کے شہنشاہ کا لقب "سورج دیوتا" تھا۔ اور جاپانیوں کی عقیدت مندی کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص شہنشاہ سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہی ذات شریف اب بھی جاپان کے شہنشاہ کہلاتے ہیں لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد وہاں جب پارلیمانی جمہوریت قائم ہوئی تو شہنشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج کی ہو گئی۔

یہودی نصرانی اور اسلامی عقائد کے مطابق پیغمبری اور بادشاہی کا دہرا منصب خدا نے سب سے پہلے حضرت داؤد کو عطا کیا۔ اُن سے پیشتر کوئی پیغمبر سیاسی اقتدار کا طلب گار نہیں ہوا اور نہ خدا نے اُس کو سیاسی اقتدار سونپا۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ کو بھی جو بنی اسرائیل کے نجات دہندہ تھے ریاست کی سربراہی نصیب نہیں ہوئی پھر وہ کون سے معاشرتی حالات تھے جن کے باعث ایک دیرینہ روایت ترک کی گئی اور ایک نئی روایت کی ریت پڑی؟

بنی اسرائیل ۴۳۰ سال تک مصر میں رہنے کے بعد جب ۱۲۲۰ ق-م میں وہاں سے نکلے تو بائبل کی کتاب خروج کے بقول اُن کی تعداد چھ لاکھ سے بھی زیادہ تھی جو یقیناً مبالغہ ہے۔ یہ لوگ بارہ قبیلوں اور سینکڑوں خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا اور ایک مجلس بزرگان جو سن رسیدہ اشخاص پر مشتمل ہوتی تھی۔ یہی مجلس بزرگان قبیلے کی عدالت کے فرائض انجام دیتی تھی۔ قبائل فقط ہنگامی حالات میں آپس میں تعاون کرتے تھے۔ وہ اتنے خود مختار اور خود سر تھے کہ حضرت موسیٰ کو سفر کے دوران اُن کو متحد رکھنے اور احکام ربانی کی اطاعت پر آمادہ کرنے میں بڑی بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ چالیس سال تک سینا اور فاران کے بیابانوں میں خاک چھاننے کے بعد آخرکار یہ انبوہ کثیر کنعان میں داخل ہوا جہاں اُن دنوں عملیقیوں، موابیوں، فلسطیوں وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں قائم تھیں۔ بنی اسرائیل نے لاکھوں باشندوں کو جان سے مارا اور اُن کے کھیتوں، باغوں، اور تاکستانوں پر قبضہ کر لیا۔ غارت گری اور تسخیر کا یہ سلسلہ عرصے تک جاری رہا یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے قبیلے الگ الگ علاقوں میں آباد ہو گئے۔

---

۶ حضرت موسیٰ کی قومیت کے بارے میں مغربی مورخین میں بڑا اختلاف ہے۔ بعضوں کا (جن میں فرائڈ کا سا یہودی اہل علم بھی شامل ہے) دعویٰ ہے کہ موسیٰ عبرانی لفظ نہیں بلکہ قدیم مصری لفظ ہے جو "اموسس" کا مخفف ہے۔ فرائڈ کا کہنا ہے کہ موسیٰ دراصل وحدانیت پرست فرعون اخناطون کے درباری امیر تھے۔ اخناطون کی وفات کے بعد آمون رع کے پروہتوں نے موحدوں کا تختہ الٹا تو موسیٰ خدا پرست اسرائیلیوں کو ساتھ لے کر ترک وطن کر گئے۔

۴ 4. Manu's Smirti : Ed. A. Buhler, P. 216, 218, Oxford, 1886

۵ 5. Heinrich Zimmler : Philosophies of India, P. 97, New York. 1953

مگر ارضِ مقدس میں مستقل بود و باش کے باوصف بنی اسرائیل کا معاشرتی نظام بدستور قبیلہ واری رہا۔ البتہ جگہ جگہ "قاضی" مقرر کر دیئے گئے۔ جو شریعت موسوی کے مطابق فیصلے صادر کرتے تھے۔ یہ تھیوکریسی کی ابتدائی شکل تھی۔ لیکن اس وقت تک کوئی اسرائیلی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی اور نہ کسی شخص کو شاہی اختیارات حاصل تھے چنانچہ بائبل کی کتاب "قضاۃ" میں اس بات کو کئی بار دہرایا گیا ہے کہ "اُن دنوں اسرائیل میں کوئی بادشاہ نہ تھا اور ہر شخص جو کچھ اُس کی نظر میں اچھا معلوم ہوتا وہی کرتا تھا" (قضاۃ باب ۱۷ : ۶)

اسرائیلیوں نے کنعان کے قدیم باشندوں کو بڑی بیدردی سے قتل کیا تھا اس کی وجہ سے آس پاس کی غیر اسرائیلی ریاستیں اُن سے سخت نفرت کرتی تھیں اور اسرائیلیوں کو ہر دم اُن کے حملے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ مفت کی دولت ہاتھ آنے اور ذاتی ملکیت کے رواج پانے کے باعث اسرائیلی قبیلوں کے مابین لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے تھے اور قبیلوں کے اندر بھی طبقاتی اونچ نیچ پیدا ہو گئی تھی۔ ان حالات میں کسی مرکزی طاقت کا قیام وقت کی اہم ضرورت بن گیا۔

اِس مرکزی طاقت کے وجود میں آنے کی داستان بائبل کی کتاب "سموئیل" میں بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب سموئیل نبی اسرائیلیوں کے "قاضی القضاۃ" تھے۔ مولانا مودودی کا یہ بیان کہ "سموئیل نبی اُس زمانے میں بنی اسرائیل پر حکومت کرتے تھے" غلط ہے (دیکھئے تفہیم القرآن جلد اول صہ ۱۸۵، ۱۸۶) کیونکہ وہ جس کتاب سموئیل سے استنباط کرتے ہیں اُس میں سموئیل کو قاضی کہا گیا ہے نہ کہ حاکم وقت۔

"وہ زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا اور وہ سال بہ سال بیت ایل اور جلجال اور مصفاہ میں دورہ کرتا اور ان سب مقاموں میں بنی اسرائیل کی عدالت کرتا تھا۔ پھر وہ رامہ میں لوٹ آتا کیونکہ وہاں اُس کا گھر تھا اور وہاں اسرائیل کی عدالت کرتا تھا۔ اور وہیں اُس نے خداوند کے لئے ایک مذبح بنایا۔

"جب سموئیل بڈھا ہو گیا تو اُس نے اپنے بیٹوں کو اسرائیلیوں کا قاضی ٹھہرایا پر اُس کے بیٹے اُس کی راہ پر نہ چلے بلکہ وہ نفع کے لالچ سے رشوت لیتے اور انصاف کا خون کر دیتے تھے۔

"تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس گئے اور اُس سے کہنے لگے کہ دیکھ تو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دے۔"[6]

سموئیل نبی بادشاہت کی اصل حقیقت سے واقف تھا لہٰذا اُس کو اسرائیلی بزرگوں کی تجویز بہت بُری لگی اور اُس نے خدا سے شکایت کی۔ خدا نے کہا کہ تو اُن کی بات مان لے البتہ اُن کو جتا دے کہ بادشاہی کیا شے ہوتی ہے۔

"اور سموئیل نے اُن لوگوں کو جو اُس سے بادشاہ کے طالب تھے خداوند کی سب باتیں کہہ سنائیں اور اُس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا۔ اُس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لئے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا اور وہ اُس کے رتھوں کے آگے آگے دوڑیں گے اور وہ اُن کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لئے جنگ کے ہتھیار اور اپنے رتھوں کے ساز بنوائے گا اور تمہاری بیٹیوں کو لے کر گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا کرے گا اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصہ لے کر اپنے خوجوں اور خادموں کو دے گا۔ اور تمہارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمہارے شکیل جوانوں اور تمہارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا اور تمہاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔[ع] تم اُس کے غلام بن جاؤ گے۔"[7]

مگر بادشاہت کی یہ نہایت سچی تصویر بھی اسرائیلیوں کو اُن کی ضد سے باز نہ رکھ سکی۔ اور وہ "کہنے لگے، نہیں، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر ہو تاکہ ہم بھی اور قوموں کی مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے"۔

آخر مجبور ہو کر سموئیل نے ساؤل کو بادشاہ مقرر کر دیا جو قبیلہ بنی یامین کے ایک "زبردست سورما" کا بیٹا تھا۔

ساؤل نے اسرائیلیوں پر تیرہ سال (۱۰۲۵ - ۱۰۱۲ ق۔م) بادشاہت کی لیکن سموئیل نبی سے اُس کی کبھی نہیں بنی۔ آخر کار ساؤل کی حرکتوں سے خدا بھی ناراض ہو گیا اور خدا نے ساؤل کی موت کے بعد بادشاہت اُس کی اولاد کے بجائے حضرت داؤد کو سونپ دی جو ساؤل کے اسلحہ بردار تھے اور بنی اسرائیل کے سب سے بڑے قبیلے یہوداہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ساؤل کے خدا کی طرف سے مامور بہ خلافت ہونے کا قصہ قرآن شریف میں بھی موجود ہے البتہ تفصیلات بائبل سے قدرے مختلف ہیں۔
(سورۃ البقرہ ۲۴۵ - ۲۴۶)

حضرت داؤد کو شہرت اُس وقت ملی جب اُنہوں نے فلسطیوں کے پہلوان جالوت کو جس سے ساؤل کا کوئی سورما لڑنے کی جرأت نہ کرتا تھا میدان جنگ میں قتل کر دیا۔ ساؤل کو یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا داؤد میرے بعد تخت شاہی کا دعویدار بن جائے لہٰذا وہ داؤد کی جان کے درپے ہو گیا لیکن داؤد اُس کے چنگل سے بچ نکلے۔ ساؤل کی موت کے بعد خدا نے داؤد کو اسرائیلیوں کا بادشاہ مقرر کر دیا:

(البقرہ ۲۵۰۰)

آخر کار اللہ کے اذن سے اُنہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کو چاہا اس کا علم دیا۔ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

اس طرح امامت اور خلافت کے عہدے جو ساؤل کے وقت میں جدا جدا منصب تھے ایک ہی شخص کو مل گئے۔ البتہ حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان کے بعد امامت اور خلافت کے عہدے دوبارہ الگ کر دیئے گئے۔ شاید یہ تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ عہد قدیم میں الوہی استحقاق کا ریاستی نظریہ ایک عالمگیر عقیدے کی حیثیت اختیا

---

[6] کتاب سموئیل ۱ باب ۷ : ۱۵ تا باب ۸ : ۵

[ع] ۔ عُشر کا دستور اسلام سے ہزاروں برس پہلے رائج تھا۔

[7] ایضاً باب ۸ : ۱۰ - ۱۸

کر گیا تھا۔ کافر، مشرک اور مومن سب کا خیال تھا کہ ریاست کی سربراہی اور ریاست کے بنیادی قوانین عالم بالا سے نازل ہوتے ہیں۔ یعنی حاکمیت اور قانون کا مخرج و منبع ریاست کے باشندے نہیں بلکہ کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے۔ وہی جس کو چاہتی ہے اقتدار عطا کرتی ہے اور جس کو چاہتی ہے اس نعمت سے محروم کر دیتی ہے۔ رعایا کا فرض حاکم وقت کی اطاعت اور اُس کے قوانین کی پابندی کرنا ہے۔

پروہتی راج کے نظریئے ملوکیت کے دور میں بدستور رائج رہے کیونکہ اُن کی تبلیغ و اشاعت بادشاہوں کے مفاد میں تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پروہت راج کے خاتمے کے بعد بھی حالات زیست میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ پُرانا اقتصادی ڈھانچہ جوں کا توں رہا۔ نہ آلات پیداوار بدلے نہ پیداواری رشتوں میں فرق آیا۔ پروہت راج میں زمین عبادت گاہوں کی ملکیت ہوتی تھی۔ بادشاہی دور میں زمین بادشاہ اور اُمراء سلطنت کی ملکیت بن گئی۔ کاشتکار، مزدور اور غلام ارسطو کے بقول "زندہ آلات" تھے سو زندہ آلات رہے۔ پُرانا زرعی نظام بدستور قائم رہا، فقط آقا بدل گئے۔

یوں بھی زرعی نظام میں کوئی اور نظریہ رواج نہیں پا سکتا تھا۔ کیونکہ زراعت پیشہ لوگ قدرت کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ علم و شعور کی کمی کی وجہ سے وہ مظاہر قدرت کے اسباب و علل کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ بارش، سیلاب، خشک سالی، اولے پالے کسی پر اُن کا اختیار نہ تھا۔ مذہبی پیشوا بھی اُن کو یہی باور کرواتے تھے کہ جو کچھ ہوتا ہے آسمانی طاقتوں کی مرضی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا لوگوں کی نظریں آسمان ہی کی طرف لگی رہتی تھیں۔ اُن کی اپنی زندگی بھی حاکم وقت کی مرضی پر منحصر تھی۔ ان حالات میں لوگوں کو یہ یقین دلانا کہ ریاست اور ریاست کے قوانین آسمان سے اُترتے ہیں زیادہ دشوار نہ تھا۔

مگر تھیوکریسی فیوڈل ازم کا ریاستی نظریہ ہی نہیں معاشرے کا ضابطۂ حیات بھی تھی۔ پیدائش سے موت تک زندگی کا کوئی ایسا موڑ نہ تھا جس سے انسان مذہبی احکام ادا کیے بغیر گزر سکتا۔ ولادت کی رسمیں، مونڈن کی رسمیں، خواندگی کی رسمیں، مذہبی تیوہاروں کی رسمیں، بالغ ہونے کی رسمیں، منگنی اور شادی بیاہ کی رسمیں تجہیز و تکفین کی رسمیں جو مُردے کے جلانے یا دفن کرنے کے بعد بھی جاری رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ غسل کرنے، دانت صاف کرنے، اٹھنے، بیٹھنے، کھانا کھانے، سونے حتیٰ کہ عورت کے ساتھ ہم بستری کے آداب بھی مقرر تھے۔ پوجا پاٹ کے قاعدے ان پر مستزاد تھے (تفصیل کے لئے دیکھئے کیمیائے سعادت از امام غزالی اور حجتہ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ)

تھیوکریسی کی افیون لیکن عوام ہی کا مقدر تھی۔ بادشاہ، شاہی خاندان کے افراد، اور اُمراء و رؤسا شرعی احکام پر بس واجبی واجبی عمل کرتے تھے۔ بادشاہ اپنے سوا کسی دوسری ریاست کے فرماں روا کے اُلوہی حق کو تسلیم نہیں کرتا تھا بلکہ موقع ملتے ہی اُس پر لشکر کشی کر دیتا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد اور اُمرا بھی بادشاہ کے خلاف سازشوں سے پرہیز نہیں کرتے تھے ورنہ زمین پر خدا کے یہ نائب وقتاً فوقتاً قتل نہ ہوتے اور نہ شاہی خاندان بدلتے رہتے۔ کوئی زہر سے ہلاک ہوتا تھا کوئی آب شمشیر سے۔ اسرائیل کے اُنیس بادشاہوں میں سے آٹھ قتل ہوئے۔ قریب قریب یہی اوسط قیصران روم کی ہلاکت کی بھی ہے جو دیوتا کہلاتے تھے۔ ایران کے قاچاری بادشاہوں میں فقط ایک کو قدرتی موت نصیب ہوئی سلاطین دہلی کو بھی انہیں حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ خاندان غلاماں کے گیارہ میں پانچ بادشاہ قتل یا برطرف ہوئے خلجیوں میں سے چھ میں سے چار اور تغلقوں میں نو میں سے پانچ پر یہی آفت آئی۔ سلطنت مغلیہ کے کل اٹھارہ بادشاہ تخت نشیں ہوئے۔ ان میں سے آخری بارہ قتل اور برطرف ہوئے یا اندھے کر دیئے گئے۔

ریاست اور رعایا کا مذہب جب تک ایک رہا شرعی قوانین کے نفاذ میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی لیکن ریاستیں جب سلطنتوں میں بدل گئیں اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی رعایا بن گئے تو رعیت اور ریاست میں تصادم نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ مثلاً بنی اسرائیل خدائے واحد کے ماننے والے اور شریعت موسوی کے پابند تھے۔ اسرائیلی علاقوں پر جب رومیوں نے قبضہ کر کے اپنے قوانین نافذ کرنے کی کوشش کی تو اسرائیلیوں نے ان قوانین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نوبت کشت و خون تک پہنچی۔ آخر طے پایا کہ یہودیوں کے آپس کے مقدموں کا فیصلہ بدستور یہودی عدالتیں کریں البتہ سلطنت کے شہری ہونے کی حیثیت سے یہودیوں کو عام رومی قوانین کی پابندی کرنی ہوگی۔ اسی تجربے کی روشنی میں حضرت مسیحؑ نے اپنے ماننے والوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "سیزر کو اُس کا حق دو اور خدا کو اُس کا حق"۔ اُنہوں نے ریاست کو مذہب سے جدا کر دیا۔

دورِ حاضر کے بعض علماء دین کو حضرت مسیحؑ کے اس قول پر سخت اعتراض ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ریاست میں کسی مذہب کے پیرو اگر اقلیت میں ہوں تو ریاستی قوانین کے بارے میں اُن کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ برطانوی عہد میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی دوسروں کی طرح انگریزی قوانین کی پیروی کی اور حضرت مسیحؑ کے مشورے پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ انگریزوں نے فوجداری کے ضابطے اور قوانین تو بلا لحاظ مذہب و ملت پورے ملک میں نافذ کر دئیے البتہ سول قوانین میں جن امور کا تعلق خالص مذہبی عقاید سے تھا اُن کے بارے میں ہندؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ قوانین بنا دیئے۔ مثلاً شادی اور طلاق، وراثت، اوقاف، عبادت گاہوں اور دینی درس گاہوں کی دیکھ بھال۔ آج بھی مسلمان اقلیت کی حیثیت میں ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ برطانیہ، فرانس، جرمنی، امریکہ، برما، تھائی لینڈ اور چین میں کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور اُن کے لئے "سیزر کا حق" ادا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ملوکیت میں بادشاہ کا مذہب ریاست کا سرکاری مذہب ہوتا تھا اور قوانین بھی مذہبی احکام کے مطابق وضع ہوتے تھے لیکن اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مطلق العنان بادشاہوں کے عہد میں مذہب ریاست کے تابع ہو گیا اور ریاست کی سیاسی مصلحتوں کو شرعی احکام پر ترجیح دی جانے لگی۔ شرعی احکام اگر سیاسی مصلحتوں سے ہم آہنگ ہوتے تو اُن سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا مگر ریاست کی بنیادی حکمت عملی اور شرعی احکام میں اگر تصادم کی صورت پیدا ہوتی تو تنخواہ دار پادریوں، پنڈتوں اور مفتیوں سے ریاست کے حق میں فیصلے حاصل کر لئے جاتے تھے اور شرعی احکام کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

تھیوکریسی میں سربراہ مملکت اور مذہبی ادارے چکی کے دو پاٹ تھے عوام جن کے درمیان پستے رہتے تھے۔ دونوں کے اختیارات کا سرچشمہ خدا کی ذات تھی یا احکام خداوندی۔ "عوام کالانعام" مویشی تھے لہٰذا ریاست کے نظم و نسق میں اُن کی کوئی آواز نہ تھی۔ ملک کا معاشرتی اور معاشی نظام کیا ہو، عنان اقتدار کن لوگوں کے ہاتھ میں ہو، طرزِ حکومت کیسی ہو، قانون کون وضع کرے، اُن پر عمل درآمد کی کیا صورت ہو اور عدالتیں کس نوع کی ہوں ان تمام اُمور کا فیصلہ بحق سربراہ محفوظ تھا۔ اور وہ کسی کے رُوبرو جواب دہ نہیں تھا نہ کوئی اُس سے باز پُرس کر سکتا تھا۔

مذہبی پیشوا سربراہ ریاست سے پورا پورا تعاون کرتے تھے اور اس تعاون کا خاطر خواہ معاوضہ پاتے تھے۔ کوئی قاضی بنتا تھا کوئی مفتی اور محتسب۔ جن کو یہ عہدے نہ ملتے وہ عقیدت مندوں کو اطاعت و فرماں برداری کا درس دے کر اپنی دنیا اور اُن

کی عاقبت درست کرتے رہتے تھے۔ اور وہ عالم فاضل بزرگ جن کو لکھنا آتا تھا ہماری دیدہ عبرت نگاہ کے لئے اپنی اطاعت گذار فہم و فراست کے ایسے ایسے نادر شاہکار چھوڑ گئے ہیں کہ مسلمانوں نے اگر اُن کے مشوروں پر عمل کیا ہوتا تو ترکی، ایران اور مصر میں مطلق العنان ملوکیت آج بھی مسلّط ہوتی اور الجزائر، لیبیا اور شام وغیرہ بدستور مغربی سامراج کے قبضے میں ہوتے۔

(۲)

پروہت راج کے خاتمے کے بعد مذہبی پیشوا مشرق میں سیاسی اقتدار کے مالک کبھی نہیں ہوئے اور نہ انہوں نے کبھی تاج و تخت کی آرزو کی۔ ہندو راجاؤں کے زمانے میں راج پاٹ کرنا دھرم شاستر کی رُو سے چھتریوں کا منصب قرار پایا اور برہمن پنڈتوں کا کام راجاؤں کو مشورے دینا اور دھرم کی حفاظت کرنا ٹھہرا۔ مسلمانوں میں بھی خلافت بنی اُمیہ سے لے کر خلافت آل عثمان اور سلطنت مغلیہ تک کسی دور میں بھی مذہبی پیشوا ربعیت کے سربراہ نہیں ہوئے۔ کلیسائے روم کی مانند یہاں کوئی مذہبی مرکز بھی نہ قائم ہو سکا جو بجائے خود ریاست ہوتا یا بادشاہوں کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنے کی جرأت کرتا۔ اگر کسی مذہبی پیشوا نے ریاست کے غیر شرعی طرز عمل سے اختلاف کیا تو اُس کو قتل یا قید کر دیا گیا یا جسمانی اذیتیں پہنچا کر راستے سے ہٹا دیا گیا۔ امام ابو حنیفہ نے بارہ سال قید میں گزارے اور قید خانے ہی میں انتقال فرمایا۔ امام احمد بن حنبل کو ننگی پیٹھ پر کوڑے لگائے گئے۔ یہی سزا مدینے کے عباسی گورنر جعفر ابن سلیمان نے امام مالک کو دی جس سے اُن کا کندھا اُکھڑ گیا۔ قدری اور معتزلہ فرقے سواد اعظم کی نظر میں کافر تھے لہٰذا اُن کے قتل میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی اور جب خلیفہ مامون رشید کے عہد میں اُن کا ستارہ چمکا تو انہوں نے اپنے مخالف علما کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس سے پیشتر اُن کے ساتھ ہوا تھا۔ اشراقی صوفی اور عالم دین شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول سلطان صلاح الدین ایوبی کے حکم سے شہید کئے گئے کیونکہ اُن کی تعلیمات "اسلام کے لئے خطرہ" تھیں۔ غرضیکہ اسلامی ریاستوں میں علمائے دین اقتدار سے منسلک ہو کر مختلف سرکاری خدمات بجالاتے رہے یا دربار سے دور رہ کر مذہب کی تعلیم دیتے رہے مگر انہوں نے عملی سیاست سے اپنا دامن حتی الوسع پاک رکھا۔

اس کے برعکس مغرب میں مسیحی کلیسا بڑی طاقت ور سیاسی قوت بن کر اُبھرا۔ رومتہ الکبریٰ کے غیر مسیحی عہد میں تو کتنے ہی پوپ اور پادری روم میں مصلوب ہوئے اور عیسائیوں کا خون بڑی بیدردی سے بہایا گیا لیکن شہنشاہ قسطنطین اول (۲۷۴ء - ۳۳۷ء) نے جب عیسائی مذہب اختیار کیا اور عیسائیت سلطنت کا سرکاری مذہب قرار پائی تو کلیسا کا وقار بہت بڑھ گیا۔

پوپ کا دعویٰ تھا کہ وہ زمین پر یسوع مسیح کا خلیفہ ہے اور عیسائیت چونکہ سلطنت کا سرکاری مذہب ہے لہٰذا قوانین دین مسیحی کے مطابق وضع ہونے چاہئیں اور عدالتیں مذہبی ہونی چاہیئے۔ دین مسیحی کی تشریح اور تاویل کا حق فقط پوپ کو حاصل ہے لہٰذا مُقننہ اور عدلیہ دونوں کلیسا کے تابع ہوں۔ بازنطینی شہنشاہوں کا اثر و اقتدار جس رفتار سے یورپ میں گھٹا کلیسا کے اثر و اقتدار میں اُسی نسبت سے اضافہ ہوا۔ پوپ کے مقرر کردہ پادری لاکھوں کی تعداد میں شہروں شہروں قریوں قریوں پھیل گئے جس طرح ریاست میں عہدہ داروں کی درجہ بندی ہوتی ہے اُسی طرح کلیسا میں بھی پادریوں کے درجے مقرر ہوئے۔ کارڈینل، آرچ بشپ، بشپ، گاؤں کا پادری سب کو پوپ نامزد کرتا تھا اور وہ پوپ کے علاوہ کسی کا حکم ماننے پر مجبور نہ تھے۔ اُن پر ریاستی عدالتوں میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا بلکہ اُن کی مذہبی عدالتوں کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنا حکومت کا فرض تھا۔ وہ اگر کسی نومولود کو بپتسمہ نہ دیتے تو وہ ذات باہر ہو جاتا تھا۔ اگر کسی کا نکاح نہ پڑھتے تو اُس کی اولاد حق وراثت سے محروم کر دی جاتی تھی۔ اگر وہ کسی کی آخری رسم ادا نہ کرتے یا نماز جنازہ نہ پڑھتے تو اُس کا مقام جہنم ہوتا۔ پادریوں کے سوا کوئی شخص بچوں کو پڑھا نہیں سکتا تھا نہ مدرسہ قائم کر سکتا تھا۔ کلیسا انسان کی پوری زندگی پر حاوی تھا۔

مگر کلیسا فقط روحانی طاقت نہ تھی بلکہ یورپ کا سب سے دولت مند اور سب سے بڑا جاگیردار بھی رومن کلیسا ہی تھا۔ اسپین میں ملک کی چوتھائی زمین کلیسا کی ملکیت تھی۔ برطانیہ میں زمین کا پانچواں حصہ، جرمنی میں تیسرا حصہ اور فرانس میں نصف رقبہ کلیسا کے قبضے میں تھا۔ ضلع لانگرے کا بشپ پورے ضلع کا مالک تھا۔ اٹلی کے شہر بولونیا کے دو ہزار گاؤں کلیسا کی ملکیت تھے۔ اسپین میں کلیسا ۴۰ قصبوں کی مالک تھی۔ فلڈا کی خانقاہ ۱۵ ہزار گاؤں کی مالک تھی۔ سینٹ گال کی خانقاہ کے پاس دو ہزار چاکر تھے، شہر ٹور کے پادری کے پاس بیس ہزار چاکر تھے۔ یہ سب زمینیں معافی تھیں۔ جن پر کوئی محصول نہ تھا اور نہ حکومت ان کے معاملات میں کوئی مداخلت کر سکتی تھی۔

ایک مورخ کے بقول "فیوڈلزم نے کلیسا کو بھی فیوڈل بنا دیا تھا۔" اس کے علاوہ اپنی آمدنی اور پیداوار کا دسواں حصہ مقامی کلیسا کو ادا کرنا ہر شخص کا قانونی فریضہ تھا۔ گرجا گھروں کو چڑھاوں اور نذرانوں سے بھی وافر رقمیں وصول ہوتی تھیں۔ مزید برآں صاحب جائداد افراد حتیٰ کہ مزارعوں سے بھی یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ مرتے وقت کلیسا کے نام کچھ نہ کچھ ترکہ ضرور چھوڑ جائیں۔ ورنہ وہ بے دین تصور کئے جائیں گے اور جہنم میں جلیں گے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جب وسطی اٹلی کا بہت بڑا علاقہ کلیسا کے قبضے میں آگیا تو کلیسا ایک خود مختار ریاست بن گئی اور پوپ ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے یورپ کی سیاست میں براہ راست حصہ لینے لگے۔

پوپ اور دوسرے بڑے پادری اطالوی ریاستوں کے شاہی خاندان سے چُنے جاتے تھے اور شاہانہ ٹھاٹ باٹھ سے رہتے تھے۔ وہ شادی نہیں کر سکتے تھے لیکن علانیہ داشتائیں رکھتے تھے اور اُن کی اولاد شہزادوں کی سی زندگی گذارتی تھی۔ کلیسا کی دولت کا سرچشمہ زمینیں تھیں اور پادری بھی فیوڈل ماحول کے پروردہ ہوتے تھے لہٰذا اُن کا قدرتی جھکاؤ فیوڈل عناصر کی جانب تھا۔ فیوڈل اُمرا کی طرح وہ بھی تاجروں اور صنعت کاروں کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے چنانچہ اُن کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی غرض سے سودی کاروبار کی سختی سے ممانعت کر دی گئی تھی۔

کلیسائے روم کی پہلی ٹکر فرانس، جرمنی، اسپین اور برطانیہ کے بادشاہوں سے ہوئی۔ بادشاہ پوپ کے روحانی اقتدار کو تو تسلیم کرتے تھے مگر پوپ کے اس دعویٰ کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ اُمور ریاست میں بھی پوپ کی اطاعت بادشاہوں کا فرض ہے۔ بادشاہوں کو کلیسا سے یہ شکایت بھی تھی کہ پوپ اور دوسرے بڑے پادری بادشاہ کے مقابلے میں نیم خود مختار نوابوں کی پشت پناہی کرتے ہیں اور اُن کو کلیسا کا عہدہ دار بنا دیتے ہیں۔ چودھویں صدی میں کلیسا اور ملوکیت کے مابین نزاع نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ فرانس کے بادشاہ فلپ چہارم نے روم پر دھاوا کر کے پوپ کلیمون پنجم کو گرفتار کر لیا اور کلیسا کا صدر مقام شہر اوینان میں منتقل کر دیا۔ پاپائے روم کو وہاں ستر سال تک (۱۳۰۹ - ۱۳۷۸ء) فرانس کی نگرانی میں رہنا پڑا۔ ۱۳۷۸ء میں اگرچہ پوپ رہا ہو کر روم واپس آیا لیکن کلیسا کا پرانا اثر و اقتدار پھر کبھی بحال نہ ہو سکا۔

مغربی مورخین کلیسا کے ہزار سالہ اقتدار کو "عہد تاریک" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہاں چوتھی صدی سے چودھویں صدی تک تعصب، تنگ نظری اور توہم پرستی کا اندھیرا چھایا رہا۔ کلیسا نے عقل و خرد پر پہرے بٹھا رکھے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ کلیسائی عقائد سے سرِمُو اختلاف کرسکے۔ ہر جگہ مذہبی عدالتیں قائم تھیں جن کے فیصلوں کی داد تھی نہ فریاد۔ چنانچہ لاکھوں بیگناہ بیدینی اور جادوگری کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ اُن کو ٹکٹکی پر باندھ کر پہلے کوڑے لگائے جاتے تھے پھر اُن کی ہڈیاں توڑی جاتی تھیں، اُن کی لاشوں کو سڑکوں پر گھسیٹا جاتا تھا اور تب چتا میں جلا دیا جاتا تھا۔ اُن کے گھروں کو آگ لگادی جاتی تھی اور اُن کا مال و متاع ضبط کر لیا جاتا تھا۔ یورپ کا ہر فرد بشر جس کو بادشاہوں کی براہ راست سرپرستی حاصل نہ تھی مذہبی عدالتوں کے خوف سے کانپتا رہتا تھا۔

اِس ہولناک ماحول میں علوم و فنون کیا ترقی کرتے۔ تعلیم کلیسا کی اجارہ داری تھی لہٰذا درس گاہوں میں فقط وہی علوم پڑھائے جاتے تھے جن سے کلیسائی عقائد کو تقویت ملتی۔ معقولات کی جگہ منقولات، درایت کی جگہ روایت اور اجتہاد کی جگہ تقلید۔ کسی اُستاد یا شاگرد کو شرعی احکام پر شک کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ کلیسا کی خرد دشمنی نے ذہنوں کو مفلوج کردیا تھا اور کوئی شخص آزادی سے سوچ نہ سکتا تھا۔

لیکن قرونِ وسطیٰ کے آخری دنوں میں جب یورپ بالخصوص اٹلی میں صنعت و حرفت اور تجارت نے ترقی کی تو حالات بدلنے لگے۔ کلیسا یورپ کا سب سے بڑا زمیندار تھا لہٰذا سرمایہ دار طبقے کے فروغ سے دوسرے فیوڈل عناصر کی طرح کلیسا کے مفاد و اقتدار پر بھی کاری ضرب لگی۔ وینس، فلورنس، جینوا اور میلان بڑے خوشحال شہر تھے۔ وہاں تاجر پیشہ طبقوں کی جمہوری ریاستیں قائم تھیں۔ وینس میں لوہے، ریشمی کپڑوں، زردوزی اور شیشہ سازی کے بڑے بڑے کارخانے تھے۔ اُس کے پاس دو سو تجارتی جہاز تھے جو مال لے کر مصر، تونس، ترکی اور اسپین تک جاتے تھے۔ فلورنس بھی بہت بڑی منڈی تھا۔ وہاں اسّی بینک روپے کا لین دین کرتے تھے اور اونی کپڑوں کی تین سو فیکٹریاں تھیں جن میں تیس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ جینوا میں کمخواب بنتا تھا اور ملاحی کام ہوتا تھا۔ غرضیکہ نوزائیدہ سرمایہ دار طبقے نے اٹلی کے سبھی بڑے شہروں پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔

شہروں میں صنعت و حرفت اور تجارت کے فروغ کا اثر دیہاتی زندگی پر بھی پڑا۔ فیکٹریوں اور بندرگاہوں میں محنت کاروں کی مانگ بڑھی تو نوابوں اور پادریوں کی زمینوں سے بندھے ہوئے چیرے (زرعی غلام) بھاگ بھاگ کر شہروں میں پناہ لینے لگے۔ فلورنس نے اعلان کیا کہ ریاست میں پناہ لینے والا ہر زرعی غلام آزاد شہری تصور کیا جائے گا۔ اور اُس کو قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔ دوسرے شہروں نے بھی زرعی غلاموں کی حوصلہ افزائی کی۔ نوابوں اور پادریوں کا طبقہ شہر کے نودولتیوں سے پہلے ہی نفرت کرتا تھا زرعی غلاموں کے بھاگنے کی وجہ سے سرمایہ دار طبقے کے تعلقات نوابوں اور پادریوں سے اور کشیدہ ہوگئے۔

اِنہیں دنوں مغربی یورپ کے تجارتی مرکزوں میں بھی کاروباری طبقے کی طاقت میں اضافہ ہوا اور بادشاہوں نے نوابوں اور پادریوں کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی خاطر سرمایہ داروں کی حوصلہ افزائی کی۔ برطانیہ میں لندن اور دوسرے کئی شہروں کو بلدیاتی اختیارات حاصل ہوگئے۔ البتہ یورپ میں کلیسا نے بلدیاتی اختیارات کی شدت سے مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں کئی جگہوں پر شہریوں کو کلیسا سے باقاعدہ مسلح جنگ لڑنی پڑی۔ بہت سے پادری ہلاک ہوئے اور گرجا گھروں کو آگ لگادی گئی۔ آخر کار کلیسا کو شکست ہوئی اور مغربی یورپ کے بیشتر شہروں مثلاً مارسیلز، ہمبرگ اور ایمسٹرڈم وغیرہ کو بھی بلدیاتی حقوق مل گئے۔

مگر تجارتی مال و اسباب کی نقل و حرکت میں یورپ کی خود مختار نوابیاں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ ہر چند کہ نواب اپنے بادشاہ کی وفاداری کا دم بھرتے تھے لیکن نوابی کے اندر انہیں کا حکم چلتا تھا۔ اُن کی اپنی عدالتیں، جیل خانے، پولیس اور فوج تھی۔ تاجروں کو ہر نوابی سے گذرتے وقت محصول ادا کرنا پڑتا اور نواب کو خوش کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً دریائے رھائن پر ۶۲ چنگیاں تھیں، دریائے لوائر (فرانس) پر ۷۴، دریائے اِلب (جرمنی) پر ۳۵ اور دریائے ڈینوب پر ۷۷۔ اگر کسی سوداگر کا مال اتفاق سے سڑک پر گر جاتا تو وہ بحق نواب ضبط ہو جاتا۔ سرمایہ داروں اور نوابوں میں نزاع کا بڑا سبب چنگیاں اور دوسری ناجائز وصولیاں تھیں۔ سرمایہ داروں نے ان چنگیوں کو توڑنے کا مطالبہ کیا تو بادشاہوں نے اُن کی حمایت کی۔

اِسی اثنا میں امریکہ اور ہندوستان کے بحری راستے دریافت ہوگئے تو بین الاقوامی تجارت کی راہیں کُھل گئیں۔ مگر تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کا مرکز اب اٹلی سے مغربی یورپ میں منتقل ہوگیا۔ امریکہ اور ہندوستان سے تجارت کرنے کی غرض سے اسپین، پرتگال، ہالینڈ فرانس اور برطانیہ میں نئی نئی تجارتی کمپنیاں قائم ہونے لگیں (ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ء میں قائم ہوئی تھی) نوآبادیاتی نظام کی داغ بیل پڑی اور جہاز سازی کی صنعت نے بہت ترقی کی۔

اِسی دَوران جرمنی میں چھاپہ خانہ ایجاد ہوا (۱۴۶۵ء) جس کے اثرات بہت دوررس ثابت ہوئے۔ کتابوں اور رسالوں کی اشاعت سے پادریوں کی ذہنی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ خواندگی میں بھی اضافہ ہوا اور لوگ کتابوں کے لئے پادریوں کے محتاج نہ رہے بلکہ اپنی مرضی سے جو کتاب چاہتے بازار سے خرید لیتے۔ ابھی تک تصنیف و تالیف بیشتر پادریوں کے حلقے تک محدود تھی۔ چھاپے خانوں کے قائم ہوجانے کے بعد وہ مصنف بھی منظرِ عام پر آئے جن کا تعلق کلیسا سے نہ تھا ایسے رسالے بھی شائع ہونے لگے جن میں پادریوں اور راہباؤں کی بدچلنی اور دنیاوی حرص و ہوس کے قصے مزے لے لے کر بیان کئے جاتے تھے۔

سائنسی ایجادیں اور دریافتیں بھی اِسی زمانے میں شروع ہوئیں اور سائنسی اندازِ فکر و نظر کی داغ بیل پڑی۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ سائنسی نظریئے اور ایجادیں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ اُن کا گرد و پیش کے حالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ سب کچھ اتفاقاً ہوجاتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ گلیلو کی دُوربین ہو یا نیوٹن کا کششِ ثقل کا نظریہ، بھاپ سے چلنے والے انجن کی ایجاد ہو یا برقی قوت کی دریافت، سب کے ٹھوس سماجی محرکات تھے۔ اِن نئی سائنسی دریافتوں سے کلیسائی عقاید و افکار کے ایوان میں زلزلہ آگیا۔ کلیسا نے نظام بطلیموس کو اپنے مذہب کا جزو بنا لیا تھا۔ کوپرنی کس، گلیلو اور کیپلر نے ثابت کردیا کہ زمین دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھومتی ہے۔ کلیسا کا دعویٰ تھا کہ زمین فرش کی مانند پانی پر بچھی ہوئی ہے۔ سائنس دانوں نے ثابت کردیا کہ زمین گول ہے اور اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔ اِسی طرح کلیسا کے دوسرے مفروضات و اذعان کی نفی ہونے لگی اور انجیل کے تقدّس اور مسیحی تعلیمات کی صداقت کو شک کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

کلیسا اپنے عقاید کی یہ کھلی توہین برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ سائنس دانوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ برونو کو آگ میں زندہ جلادیا گیا حالانکہ وہ پادری تھا۔ گلیلو پر مذہبی عدالت میں مقدمہ چلا۔ اُس نے توبہ کرلی مگر چپکے سے بولا کہ میں مانوں یا نہ

مانوں زمین تو بہر حال گھومتی رہے گی۔ سائنس دانوں کی کتابیں نذرِ آتش ہوئیں اور اُن کا پڑھنا اور رکھنا جُرم قرار پایا لیکن صنعت کاروں نے سائنسی ایجادوں سے خوب فائدہ اُٹھایا اور سائنسی علوم کی مقبولیت برابر بڑھتی گئی۔

مارٹن لوتھر، تھامس مونٹسر، زونگلی اور کالون کی مذہبی بغاوتوں نے بھی کلیسا کے وقار کو سخت صدمہ پہنچایا۔ یہ لوگ خود پادری تھے لیکن کلیسا کے جور وستم سے اُن کا پیمانۂ صبر بھی چھلک اُٹھا۔ پادری سادہ لوح عقیدت مندوں سے رقم لے کر جنت کے پروانے جاری کرتے تھے۔ اور گنڈے تعویذیں بانٹ کر توہم پرستوں کو اپنے جال میں پھنساتے تھے۔ مارٹن لوتھر وغیرہ نے پوپ سے ان بدعنوانیوں کو روکنے کی درخواست کی تو اُلٹے اُن کو مذہب سے خارج کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی، شمالی یورپ، ہالینڈ، بلجیم برطانیہ ہر جگہ پوپ کی مخالفت شروع ہو گئی اور پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا جس نے کلیسائے روم سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ نئے فرقے کی بنیادی تعلیم یہ تھی کہ خدا اور انسان کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ انجیل اپنی زبان میں پڑھے، اپنی زبان میں عبادت کرے اور اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرے۔

ان معاشرتی اور مذہبی انقلابات کا اثر طرزِ حکومت پر بھی پڑا۔ ابھی تک ریاست پر فیوڈل عناصر کا قبضہ تھا مگر معاشرے میں طاقت کا توازن بدلا تو تاجروں اور صنعتکاروں نے نظم ونسق میں شرکت کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اُنہوں نے شہریوں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے عوام کے حقوق کا پیوند بھی لگا لیا۔ رومن کلیسا کو نیچا دکھانے میں پہل برطانیہ نے کی تھی۔ ہنری ہشتم (۱۵۰۹-۱۵۴۷ء) نے روم سے ناتا توڑ لیا تھا، کلیسا کی جائدادیں ضبط کر لی تھیں اور پادریوں کو درس گاہوں سے نکال دیا تھا لیکن فیوڈلزم کا ریاستی نظریہ اُلوہی استحقاق ملوکیت بدستور رائج تھا بلکہ ہنری ہشتم نے تو اسی نظریے کی آڑ میں پوپ سے ٹکر لی تھی۔ لیکن سترھویں صدی کا برطانوی معاشرہ سو سال پہلے کا معاشرہ نہ تھا۔ اب برطانوی پارلیمنٹ لندن کے تاجروں کے زیرِ اثر تھی۔ اُن کو بادشاہ جیمس اوّل (۱۶۰۳ء-۱۶۲۵ء) سے یہ شکایت تھی کہ وہ پارلیمنٹ سے پوچھے بغیر ٹیکس لگا دیتا ہے، سرکاری قرضے لیتا ہے، لوگوں کو بتائے اور مقدمہ چلائے بغیر قید کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے ملک میں مارشل لا لگا دیتا ہے۔ بادشاہ کا کہنا تھا کہ "ہم خدا کی ناقابلِ تغیر مرضی ومنشا کے حقیقی ترجمان ہیں لہٰذا ہمارا ہر عمل درست ہے۔ اور تم کو اعتراض کا کوئی حق نہیں"۔ لیکن پارلیمنٹ نے بادشاہ کے اُلوہی استحقاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ اور پارلیمنٹ کی اس نزاع نے آئینی بحران کی شکل اختیار کر لی۔ سوال یہ تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مرکز پارلیمنٹ ہے یا بادشاہ جو خدا کی نمائندگی کا دعویٰ کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کا موقف یہ تھا کہ

> "شہری آزادیاں، ذمہ داریاں، مراعات اور پارلیمنٹ کا حلقۂ اختیار انگلستان کے باشندوں کا قدیم پیدائشی حق اور ورثہ ہے اور یہ کہ بادشاہ کی شخصیت، مملکت کے اُصول، قلمرو کا دفاع، مذہبی اُمور، قانون سازی قوانین کا نفاذ اور شکائتوں کی تلافی، یہ تمام موضوعات پارلیمنٹ میں بحث ومباحثہ اور غور وفکر کے مناسب موضوعات ہیں" (۱۶۲۱ء)

بادشاہ نے پارلیمنٹ کے ان مطالبات کو رد کر دیا۔ پارلیمنٹ توڑ دی اور اُس کے سات سربرآوردہ ارکان کو قید کر دیا۔ لیکن تحریک نہ دبی۔ بلکہ اُس کے بیٹے چارلس اول (۱۶۲۵ء-۱۶۴۹ء) کے عہد میں پارلیمنٹ اور بادشاہ کی نزاع نے بالآخر خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ پانچ سال کی خون ریزی کے بعد چارلس اول نے شکست کھائی اُس کا سر قلم ہوا اور برطانیہ ری پبلک بن گیا۔ اُلوہی استحقاق کا نظریہ بادشاہ کے خون کے ساتھ خاک میں مل گیا۔ ۱۶۸۸ء میں اگرچہ ملوکیت بحال ہوئی مگر فیوڈل عناصر نے برسرِ اقتدار سرمایہ دار طبقے سے سمجھوتہ کر لیا اور کسی نے پھر اُلوہی استحقاق کا نام نہ لیا۔ ملوکیت پارلیمنٹ کے تابع ہو کر آئینی ملوکیت ہو گئی۔

برطانیہ نے تھیوکریسی کو ختم کرنے میں سبقت کی لیکن بقیہ یورپ کو اس عمل کی تکمیل میں مزید سو سال لگے۔ اور تب انقلابِ فرانس نے تھیوکریسی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ فیوڈل ازم کے تینوں ستون —— ملوکیت، کلیسائیت اور نوابی —— زمین پر آ رہے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ رومن کلیسا کی خود مختار مملکت جو تھیوکریسی کا سب سے مضبوط قلعہ تھی فقط ۱۰۹ ایکڑ زمین کی مالک رہ گئی۔ اب وہ روم کا ایک محلہ ہے جس کی آبادی کُل ایک ہزار ہے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی کو یورپ میں خرد مندی اور خرد افروزی کا عہد کہا جاتا ہے۔ اس دَور میں صنعتی انقلاب اور سائنسی علوم کی ترقی کے باعث مغربی معاشرے کی کایا پلٹ گئی۔ عقل آزاد ہوئی۔ اور سائنس دانوں، فلسفیوں اور سیاسی مفکروں نے قرونِ وسطیٰ کے فرسودہ عقاید و نظریات کے بخیے اُدھیڑ دئے۔ بیکن، ہابس، لاک، ملٹن، والٹیر، دیدرو، اولباخ، ایلوتیئیس، گے سندی، ڈیکارٹ، لامارتی، کانٹ، اسپائنوزا، لائبنیز، روسو، ہرڈر اور مانتسکیو جیسے روشن خیال دانش وروں کی تحریریں شوق سے پڑھی جانے لگیں۔ اور جمہوریت، مساوات، نمائندہ طرزِ حکومت، تقسیمِ اختیارات، حُبِ بشر، سلطانیٔ جمہور اور کمیونزم سوشلزم کا چرچا عام ہوا۔ دنیا سماجی انقلاب کے نئے دَور میں داخل ہو گئی۔

تھیوکریسی کے آغاز اور عروج وزوال کے اس جائزے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تھیوکریسی کوئی ابدی اور مقدس نظریۂ ریاست نہیں ہے بلکہ معاشرتی ارتقا کے ایک مخصوص عہد میں تاریخی ضرورتوں کے تحت وجود میں آئی اور جب یہ ضرورتیں باقی نہ رہیں تو تھیوکریسی کا بھی وہی انجام ہوا جو غلامی کا ہوا۔

تھیوکریسی پروہت راج اور فیوڈلزم کا نظریۂ ریاست تھی۔ موجودہ دور میں جب صنعتی انقلاب کے باعث معاشرے کے حالاتِ زیست بدل گئے ہیں، سائنسی علوم نے تھیوکریسی کے تمام ازعان ومفروضات کا بھرم کھول دیا ہے اور فیوڈلزم کا چل چلاؤ ہے

تھیوکریسی کے احیا کی کوشش ارتقائے انسانی کو پیچھے کی طرف لے جانا ہے۔ تھیوکریسی جمہوریت اور جمہوری قدروں کی نفی کرتی ہے۔ تھیوکریسی معاشرے کو آگے لے جانے کی بجائے لوگوں کو ماضی کا سنہرا خواب دکھاتی ہے۔ تھیوکریسی سائنسی علوم اور سائنسی سوچ کی دشمن ہے۔ وہ اجتہاد کے بجائے تقلید اور تحقیق وجستجو کے بجائے منقولات اور روایت پرستی کی تعلیم دیتی ہے۔ تھیوکریسی خوف اور لالچ کی عفریتی قوتوں سے عقل وخرد کا گلا گھونٹنے کے درپے رہتی ہے۔ تھیوکریسی ظلمت پرستوں کا آخری حربہ ہے جو خدا کی حاکمیت کی آڑ میں تنگ نظر ملاؤں کا راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ فیوڈلزم اور فیوڈل قدروں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور عوام کو اُن کے پیدائشی حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

قیمت فی پرچہ ۸ روپے